www.KitaboSunnat.com
داستانِ اندلس
مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل
ڈاکٹر محمد احسن
نشریات

ڈاکٹر محمد احسن

۲۰۱۰ء

نام کتاب : داستانِ اندلس
مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل

مصنف : ڈاکٹر محمد احسن

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
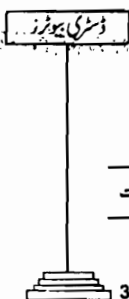
پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ سیرت نبوی ﷺ اور اقبالیات آپ کے خصوصی میدان تھے۔ اپنے انتقال سے چند روز پہلے آپ نے راقم کے اس سفر نامے کا مطالعہ کر کے چند سطور رقم فرمائیں، جو میرے لیے باعث افتخار ہے۔ حق تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ پروفیسر صاحب کے علمی فیضان کو جاری رکھے اور جنت الفردوس میں اُنہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ترتیب

www.KitaboSunnat.com

حرفِ اوّل

تاریخ کے مطابق بلاشبہ دنیا میں بڑی بڑی بادشاہتیں آئیں اور چلی گئیں۔ لاتعداد حکمرانوں نے اپنی رعایا کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ کئی سلطنتیں ایسی گزریں جن میں عام لوگ بھی خوش حالی سے ہمکنار ہوئے۔ بہت سے ادوار امن و آشتی کے بھی گزرے جن میں تہذیب وتمدن نے خوب ترقی کی۔ اسی تناظر میں دیکھا جائے تو عہد وسطیٰ کے اندلس میں آٹھ صدیوں پر محیط مسلم دور حکومت پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ بہت سے مؤرخین کے مطابق اس عہد میں ہونے والی علمی، فنی، سائنسی اور تہذیبی ترقی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی تھی۔ تاریخ میں اس عہد کے حالات و واقعات پڑھ کر بسا اوقات ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی خوابوں کی دنیا کے افسانے ہیں۔ بلاشبہ عمومی طور پر بیشتر مغربی مؤرخین نے اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس کے باوجود بھی اندلسی عہد ایک ایسا دورانیہ ہے جس کی وہ بھی اکثر اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں میں تفصیل میں جانے سے گریز کروں گا کیونکہ اس عہد کے بہت سے حالات و واقعات آئندہ صفحات میں مذکور ہیں۔

میں یہ بتاتا چلوں کہ مجھے ذاتی طور پر مسلمانوں کے اندلسی دور کی تاریخ پڑھنے کا بچپن ہی سے بڑا شوق رہا ہے اور میں شروع ہی سے وہاں پر موجود عہد اسلام کے چند بچے کھچے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا بڑا ہی مشتاق رہا ہوں۔ دراصل اس عہد کی ترقی اور خوشحالی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس دور میں مملکت اندلس میں موجود

یہودی اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی پھلنے پھولنے کے خوب مواقع حاصل تھے جس کی بنا پر ان لوگوں میں بھی بڑے بڑے علماء اور حکماء پیدا ہوئے جو اعلیٰ ترین سرکاری و درباری عہدوں پر فائز ہوئے۔ اسی پس منظر میں میری دیرینہ خواہش تھی کہ جب کبھی موقع ملے تو اندلس کے مجوزہ دورے کے دوران میں یہودی اور عیسائی عقائد کے حامل افراد بھی ساتھ ہوں تو زیادہ بہتر ہوگا تاکہ وہ بھی اپنی آنکھوں سے ان تاریخی حقائق کا مشاہدہ کر سکیں۔ خوش قسمتی سے مجھے یہ موقع ۲۰۰۶ء کے اواخر میں ملا۔ اس سلسلے میں اگرچہ دیگر کئی مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک وفد تو تیار نہ کیا جا سکا تاہم پھر بھی حالات کے پیش نظر ہم دو مذاہب کے پیروکار ضرور اکٹھے ہو گئے۔ سفر کے دوران تین افراد پر مشتمل اس چھوٹے سے قافلے میں ایک اسلام کا نام لیوا یہ بندہ تھا جبکہ دوسرے دونوں عیسائی مذہب کے ممتاز رہنما تھے۔

جیسا کے آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ بلاشبہ یہ میری زندگی کا ایک یادگار سفر تھا جو کبھی نہ بھول سکے گا۔ اگرچہ اس سفر کے شروع میں میرا سفرنامہ وغیرہ لکھنے کا پروگرام نہیں تھا تاہم اس سفر کے دوران میں مسلم تاریخ کے کئی شاندار آثار دیکھ کر میرے دلی جذبات واحساسات نے مجھے مجبور کر دیا کہ انھیں نہ صرف کاغذ پر منتقل کر دیا جائے بلکہ اس شعبے سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچایا جائے۔ یہاں میں اپنے قارئین کرام سے یہ عرض کرتا چلوں کہ اگرچہ الحمدللہ میں اپنے طویل علمی وادبی سفر میں قومی و بین الاقوامی امور پر متعدد کتب اور کئی مقالا جات تحریر کر چکا ہوں تاہم موجودہ سفرنامہ لکھنے اور اپنے دل کی آواز اور ذاتی احساسات کو ضبط تحریر میں لانے سے جو لطف وسرور مجھے اس موقع پر حاصل ہوا وہ اس سے قبل کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

اس سفرنامے کے بارے میں یہ گزارش کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے تحریر کرتے وقت میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اسے کوئی علمی وادبی یا تاریخی دستاویز کا روپ

نہ دیا جائے بلکہ اس کے برعکس قارئین کے دلچسپی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے دوران سفر اپنے مشاہدات، احساسات اور ان سے متعلقہ تاریخی پس منظر کا مجموعہ بنا کر پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آئندہ کے صفحات پڑھنے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہیں تو آپ اس وقت کی تاریخ پڑھ رہے ہیں اور کہیں دوران سفر میں جو کچھ میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں وہ بعینہٖ آپ کو دکھا رہا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ کئی مواقع پر آپ میرے دل کے اندر جھانک کر میرے جذبات و احساسات کو بھی ان کی اصلی صورت میں دیکھ سکیں گے۔ یقین جانیے کہ یہی سب کچھ آپ کو دکھانا اور محسوس کروانا اس سفرنامے کی تحریر کا اوّلین مقصد ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ غیر روایتی طرز تحریر آپ کے تجسس وتسکین کا مناسب سامان مہیا کرے گا۔ دوران مطالعہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ کبھی میں زمانۂ حال میں ہوتا ہوں تو کبھی کئی گذشتہ صدیاں پھلانگ کر عہد وسطیٰ کے اندلس میں جا پہنچتا ہوں۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ مسلم دور کی اس مخصوص تاریخ اور اس میں میری بے پناہ دلچسپی کے باعث جذبات و احساسات کی یہ لہریں اور حال و ماضی کے مابین شٹل کی مانند میرا آنا جانا ایک قدرتی عمل تھا جو بلاشبہ میرے اختیار سے باہر تھا۔ مجھے امید ہے کہ انواع واقسام کے ان تمام تذکروں سے آپ ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ مزید برآں اندلسی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر کے اور اس دور کے مسلم حکمرانوں کی کئی غلطیاں جان کر آپ یہ بھی اندازہ کر سکیں گے کہ کیا ہم آج پھر وہی غلطیاں دوبارہ تو نہیں دہرا رہے۔ بلاشبہ تاریخ کا مطالعہ بذات خود ایک بہت بڑا سبق ہے اور اس سے ہمیں ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ اللہ کرے آج کے مسلم حکمران بھی فہم وفراست کا ثبوت دیں اور تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے امت مسلمہ کے مستقبل کی فکر کریں کیونکہ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن

انگلینڈ

اندلس: تاریخی پس منظر

تاریخ کی اصطلاح سے عام طور پر ایسے حالات و واقعات کا بیان مراد ہوتا ہے جو کہ ماضی کے کسی حصے میں وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ تاہم یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہ حالات وواقعات کبھی بھی ایک دوسرے سے علیحدہ وتنہا رونما نہیں ہوتے بلکہ ان کا ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص ربط وتعلق ہوتا ہے۔ اب یہ امر تاریخ لکھنے والے پر منحصر ہے کہ آیا وہ ان حالات و واقعات کو ان کے اصل پس منظر میں بیان کرتا ہے یا پھر ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ عام کہاوت ہے کہ تاریخ ہمیشہ فاتح لکھا کرتا ہے کیونکہ مفتوح کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی تناظر میں اگر موجودہ حالات پر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت امت مسلمہ ایک مغلوب قوم کی حیثیت سے جی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی مؤرخین کا طوطی بول رہا ہے انھی مؤرخین میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اسلامی تاریخ بیان کرتے وقت اپنے تعصب کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی۔ چنانچہ حقائق ان کے زور قلم کے نیچے دبتے چلے گئے اس حقیقت کا اطلاق اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ بیان کرنے پر بھی ہوتا ہے۔

قارئین کرام! یہاں میں اپنے سفر کا حال بیان کرنے کے علاوہ کوشش کروں گا کہ ساتھ ہی ساتھ آپ کو اس تاریخی پس منظر سے بھی آگاہ کرتا رہوں جو آپ کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے موجودہ سپین اور پرتگال پر تقریباً آٹھ سو سال تک شاندار انداز میں حکومت کی۔ تاریخ

میں یہ مملکت اندلس کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اندلس کی اصطلاح کی جڑیں درحقیقت نہ صرف اسلامی ثقافت و زبان دانی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں بلکہ یہ اپنے اندر وسیع معنی بھی سموئے ہوئے ہے۔ تاہم اس کا سب سے عام فہم معنیٰ و پس منظر یہ ہے کہ ایسی سرزمین جو طویل عرصے تک بنجر اور بے آب و گیا رہنے کے بعد یکا یک سرسبز و شاداب خطے میں تبدیل ہوگئی ہو۔ بلاشبہ اگر اس خطے کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت پر نظر ڈالی جائے تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس پورے ملک کی قسمت ہی بدل گئی تھی۔

قبل اس کے کہ ہم اس خطے کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ آج کا اندلس جہاں عہد اسلام کے چند آثار باقی ہیں، انگریزی زبان میں اندلوسیا کہلاتا ہے اور اب یہ اصطلاح صرف موجودہ سپین کے جنوبی خطے کے لیے ہی استعمال کی جاتی ہے۔ بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس کے سنگم پر واقع اس خطے کا رقبہ ۸۷۰۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ خالق کائنات نے اس پورے علاقے میں اپنی شانِ خلاقی کا بھی کیا خوب ثبوت پیش کیا ہے کہ یہاں آج کے جدید یورپ اور پس ماندہ افریقہ کے درمیان محض چودہ کلومیٹر چوڑی آبنائے جبل الطارق جدائی ڈالتی ہے۔ اسی آبنائے کے دہانے پر واقع جبل الطارق اپنی انوکھی اور حیرت انگیز ساخت کی وجہ سے رب قدیر کی کاری گری اور صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عہد حاضر کے آزاد دور میں بھی جبل الطارق ہنوز نو آبادی ہی چلی آرہی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو عجیب بات یہ ہے کہ اگر مطلع صاف ہو تو یہاں پر کھڑے ہو کر محض خالی آنکھ سے ہی مراکش کے جزائر واضح نظر آتے ہیں۔

ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی دس لاکھ سال قبل بھی اندلس میں انسانی آبادی کے آثار موجود تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہ خطہ افریقہ اور

یورپ کے مابین انسانی آمد و رفت کے لیے پُل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں بودوباش اور تہذیب وتمدن فروغ پاتے رہے۔ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح میں یہاں تارتیسس کی بادشاہت قائم ہوئی۔ بائبل اور دیگر یونانی اور لاطینی مذہبی تحریروں میں اس سلطنت کا ذکر تارشیش کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس عہد میں صنعت و حرفت خصوصاً سونے چاندی اور دھاتی اشیاء کی تیاری وتجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں دولت کی فراوانی نے دوسرے خطوں کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسی بنا پر یونانیوں نے یہاں اپنی تجارتی نو آبادیاں قائم کرنا شروع کیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برصغیر میں برطانوی نو آبادیاتی نظام کے قیام کی طرح، یونانی بھی جو یہاں محض تجارت کی غرض سے آئے تھے اس خطے کی مالک بن بیٹھے۔ وقت گزرنے کی ساتھ ساتھ انھوں نے رعایا پر بھاری ٹیکسوں کے اطلاق کے علاوہ ظلم و ستم بھی ڈھانا شروع کر دیا۔ آخر یہ جبر و استبداد کب تک چلتا۔ لوگوں نے تنگ آ کر دیگر بیرونی عناصر کو خوش آمدید کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ رومیوں نے اس کو موقع غنیمت جانا اور سلسلہ وار لڑائیوں کے بعد ۴۵ قبل مسیح میں قیصر روم نے قرطبہ کے جنوب میں مندہ کے مقام پر اپنی فتح کا جشن منایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطنت کے حسن انتظام کی وجہ سے رومی عہد میں اس خطے نے ترقی کی کئی منازل طے کیں۔ یہی وجہ تھی کہ آئندہ چار صدیوں تک یہاں خوشحالی و فراوانی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ تاہم چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں رومیوں نے بھی اپنے پیش رو یونانیوں کی روش اختیار کی اور آہستہ آہستہ وہ بھی تنزل و پستی کی طرف اترتے گئے۔ اس مسلسل اِدبار و زوال سے بچنے کی خاطر عیسائی کلیساؤں کی ایک کونسل قائم کی گئی جس نے بہت سے حکومتی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ تاہم یہ بیساکھیاں بھی گرتی ہوئی سلطنت کو سہارا نہ دے سکیں۔ رہی سہی کسر کیتھولک ویسیگوتھوں نے پوری کر دی۔ چنانچہ ۷۱۰ء میں شاہ ویتیذا کی ہلاکت کے

بعد اس خاندان کے مخالف شاہ راڈرک نے اقتدار پر زبردستی قبضہ کرلیا۔ حقیقت یہ ہے اس خطے کے عوام گذشتہ کئی دہائیوں سے سرکاری و درباری سازشوں اور ظلم و جبر سے تنگ آئے ہوئے تھے اور انھیں اس منحوس شکنجے سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت بھی نظر نہ آتی تھی۔ اسی دوران ویتیزا خاندان کو اپنے ہاتھ سے اقتدار کے نکل جانے کا غم بھی بہت گراں گزرا تھا۔ چنانچہ اس خاندان نے ہر قیمت پر راڈرک کو نیچا دکھانے کی خاطر شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ طویل عرصے سے اغیار کی ستم ظریفیاں سہتے ہوئے عوام بھی اب کسی ممکنہ تبدیلی کے خواہاں تھے۔

موضوع کی مناسبت سے یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ بہت سے مغربی مؤرخین اپنے خود ساختہ تعصب کے خول سے باہر نہ نکل سکنے کی وجہ سے عالم اسلام کی تاریخ کے بارے میں حقائق کو بہت ہی مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے مؤرخ اپنی تحریروں میں بیشتر توانائیاں یہ ثابت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ سلطنت اسلامیہ زیادہ تر بنجر علاقوں پر مشتمل تھی جس کی بنا پر پڑوسی ممالک پر چڑھائی کر کے لوٹ مار کرنا یا قبضہ کر لینا اس کی بقا کا لازمی عنصر رہا ہے۔ مزید برآں وہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ مسلم آرمی کو حکومت کی جانب سے کوئی باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی جس کی وجہ سے اس کی گزر اوقات بھی کلی طور پر جنگ و جدل اور مال غنیمت پر ہی منحصر تھی۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالبعلم بھی تعصب کی عینک اتار کر دیکھے تو اسے معلوم ہو گا کہ مسلم سلطنت میں شامل شام، فلسطین اور مصر کے علاقے اپنی زرخیزی اور شادابی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسی طرح اہل حجاز بین الاقوامی تجارت میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ مسلم فوج کو باقاعدہ تنخواہ دینے

کا طریقہ تو خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے ہی جاری و ساری تھا۔ تیسری اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اگر ان غیر مسلم مؤرخین کے تعصب پر مبنی مذکورہ نظریے کو وقتی طور پر درست بھی مان لیا جائے تو اس کا اطلاق دیگر غیر مسلم سلطنتوں اور تہذیبوں پر بھی ہونا چاہیے نہ کہ صرف مسلمانوں پر ہی یہ تہمت لگائی جائے۔ تاہم تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے ہسپانیہ پر حملہ کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی یا یہ محض مال غنیمت اکٹھا کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ جیسا کہ اس باب کے شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اگر تاریخ کا گہرا اور غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے تمام اگلے پچھلے حالات و واقعات مربوط انداز میں ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بلاشبہ ہسپانیہ کی تاریخ بھی اس حقیقت سے مبرا نہیں۔ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ شاہ راڈرک نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ ملک کو مغلوب کرنے کے ساتھ ساتھ دولت اور طاقت کا نشہ خود اس کے ضمیر کو بھی مغلوب کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی کئی ناپسندیدہ حرکتوں کی بنا پر عوام اور امراء میں بہت غیر مقبول تھا۔ اللہ کی مشیت کے تحت اسی دوران ایک واقعہ ایسا بھی رونما ہو گیا جو بعد میں خود بخود مسلمانوں کے لیے اس ملک کے دروازے کھولنے کا باعث بن گیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسی دور میں مراکش کے شمالی ساحل پر ایک قصبہ کیوطا کے نام سے مشہور تھا۔ اپنی پتھریلی زمین، مخصوص محل وقوع اور تقریباً چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہونے کی وجہ سے یہ قصبہ جنگی اور دفاعی نقطۂ نظر سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جزیرہ نما اس قصبے کو ایک بہت ہی تنگ خاکنائے مراکش سے ملاتی ہے۔ آج یہ قصبہ مراکش کے بجائے ہسپانیہ کا حصہ ہے، تاہم اس دور میں یہ علاقہ اگرچہ بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا مگر یہاں کا اصل حکمران عیسائی مذہب کا پیروکار کاؤنٹ جولین

تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ جولین کی بیوی شاہ ویتیزا کی بیٹی تھی جسے راڈرک نے اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔ اقتدار اور کرسی کا نشہ بھی کیا خوب ہوتا ہے جو انسان سے وہ سب کچھ کروا لیتا ہے جسے وہ عام حالات میں کبھی نہیں کرتا۔ اسی ضمن میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی خاطر جولین نے نہ صرف راڈرک سے بھرپور انداز میں دوستی شروع کر لی بلکہ اس تعلق کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اپنی ایک نوعمر بیٹی فلورنڈا کو بھی اس کے محل میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں شاہی آداب و اطوار سیکھ سکے۔ کہتے ہیں کہ فلورنڈا بہت خوبصورت تھی اور شراب و اقتدار کے نشے میں راڈرک نے اس کی عزت لوٹ لی تھی۔ مظلوم فلورنڈا نے ایک خفیہ قاصد کے ذریعے سے اپنے باپ کو اس ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ قدرتی بات تھی کہ اپنی خاندانی ذلت دیکھ کر جولین کا خون کھولنے لگا اور اس نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ تاہم وہ اس قابل ہرگز نہ تھا کہ راڈرک سے ٹکر لے سکے، چنانچہ اس نے اس مقصد کے حصول کی خاطر اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کیا اور ساتھ ہی ساتھ ظاہری طور پر راڈرک سے حسب معمول اچھے تعلقات بھی برقرار رکھے تاکہ اسے اندرونی منصوبے کی خبر نہ ہو سکے۔

مذہبی عداوت کی بناء پر جولین کے اپنے ہم عصر اور مدمقابل شمالی افریقہ کے مسلم گورنر موسیٰ بن نصیر کے ساتھ کوئی اچھے تعلقات نہیں تھے۔ تاہم یکایک حالات تبدیل ہونے کے بعد جولین نے بھی قلابازی کھائی اور موسیٰ بن نصیر کو دوستی کا پروانہ بھیج کر اپنے تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ تجویز بھی دی کہ اگر مسلمان ہسپانیہ پر حملہ کر دیں تو وہ اس سلسلے میں ان کی بھرپور مدد کرے گا۔ موسیٰ بن نصیر ایک منجھا ہوا سیاستدان، اعلیٰ درجے کا منتظم اور صاحب بصیرت جرنیل تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مخالف پر اندھا اعتماد کر کے فوری حامی بھرنے کے بجائے کئی مہینوں تک بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا اور ساتھ ہی ساتھ ہسپانیہ کے حالات کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیتا رہا۔

جولین نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے پیش نظر نہایت چالا کی سے ایک اور چال چلی۔ اس نے راڈرک سے کہا کہ مسلمان ہسپانیہ پر ایک بڑا حملہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور میں اتنا طاقتور نہیں ہوں کہ ان کا راستہ روک سکوں۔ لہٰذا تم ایک بڑی فوج میرے ہاں بھیج دو تا کہ ضرورت پڑنے پر میں مسلمانوں کو سبق سکھا سکوں۔ درحقیقت جولین کی اس چال کا مقصد یہ تھا کہ راڈرک کی طاقت کو کم کیا جا سکے تا کہ جب وہاں مسلمان حملہ کریں تو انھیں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ راڈرک بہ آسانی اس جال میں پھنس گیا۔

اسی دور میں اسلامی سلطنت کا دارالحکومت دمشق ہوا کرتا تھا اور ولید بن عبدالملک خلیفہ تھے۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ سلطنت وسط ایشیاء اور مشرق وسطیٰ سے لے کر شمال مغربی افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت میں بھی مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے خلیفہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور ہسپانیہ پر لشکر کشی کی اجازت چاہی۔ دربار خلافت میں مشورے کے بعد خلیفہ نے موسیٰ بن نصیر کو اس فوجی مہم کا اختیار دے دیا مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ نہایت احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم اُٹھایا جائے تا کہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔

اللہ کی شان بھی بڑی عظیم اور نرالی ہے جو پل میں شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنا دیتی ہے۔ موسیٰ بن نصیر کی زندگی اس کی واضح مثال ہے۔ بہت سال پہلے کی بات ہے کہ جب خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دور تھا، اسلامی فوج نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں فارس جیسی عظیم اور طاقتور سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ دراصل اس وقت موجودہ عراق کا بیشتر علاقہ بھی اسی سلطنت کے زیر اثر ہوا کرتا تھا۔ اسی خطے میں اپنی فوجی مہموں کے دوران ایک دفعہ مسلم فوج نے اینوط التمر کا قلعہ فتح کیا۔ اس کارروائی کے اختتام پر وہ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں بہت سے عرب لڑکوں کو آتش پرستی

کی تعلیم دی جا رہی ہے تا کہ آگے چل کر وہ مجوسی مذہب کے مبلغ بن سکیں۔ مسلم فوج نے ان تمام طالب علموں کو اس ظلمت کدۂ ضلالت و گمراہی سے نکال کر اسلام کی روشنی سے منور کیا۔ انھی لڑکوں میں سے ایک کا نام نصیر تھا جو عرب کے اللخم قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نصیر کو اس کی ذہانت اور جسمانی پختگی کی بنا پر خصوصی تعلیم و تربیت دی گئی۔ بعد میں یہی نصیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درباریوں میں شامل ہوا۔ اس ترقی کے ساتھ ساتھ اللہ نے اس کے اہل و اعیال میں بھی خوب اضافہ کیا اور کئی بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک موسیٰ بن نصیر تھا جو ۶۴۱ء میں پیدا ہوا۔

عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں مسلمانوں نے خشکی کے کئی دور دراز کے علاقے فتح کرنے کے علاوہ سمندری جزیروں پر بھی دستک دینا شروع کر دی تھی۔ اسی عہد میں قبرص فتح ہوا اور اس بہت بڑی بحری فوجی مہم میں نوجوان کمانڈر موسیٰ بن نصیر بھی شامل تھا۔ اپنی نمایاں کارکردگی کی وجہ سے موسیٰ بن نصیر کو اس مہم کے بعد بہت عزت و شہرت حاصل ہوئی۔ اسی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر ۷۰۲ء میں اسے شمال مغربی افریقہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دنیا کے کئی دوسرے خطوں کی طرح لسانی، نسلی اور طبقاتی اعتبار سے شمالی افریقہ کا علاقہ بھی متفرقات کا مجموعہ تھا بالخصوص یہاں کے مقامی بربر قبائل تو اپنی سختی اور مزاحمت کی وجہ سے ہمیشہ ہی مشہور رہے ہیں۔ اس بنا پر انھیں قابو میں رکھنا ہر حکمران کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے اپنی ذہانت و تدبیر اور حسن سلوک کی بنا پر بڑی حد تک ان قبائل پر قابو پانے کے علاوہ ان کو حلقہ بگوش اسلام بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ کئی بربر شخصیات کو بڑے بڑے حکومتی عہدوں سے نوازا گیا۔ انھی میں سے ایک طارق بن زیاد بھی تھا جسے موسیٰ بن نصیر نے وسیع علاقے کا حکمران بنا کر تیس ہزار کی فوج بھی اس کی کمان میں دے دی تھی۔

جولین کی تجویز کے پس منظر میں موسیٰ بن نصیر نے حالات کا مزید جائزہ لینے کی

خاطر ۷۱۰ء میں اپنے ایک بربر کمانڈر طاریف بن مالک کو پانچ سو سپہ سالاروں کے ساتھ جنوبی ہسپانیہ کے ساحلی علاقوں میں بھیجا۔ طاریف جبل الطارق کے جنوب مغربی ساحل کے جس مقام پر اترا وہاں بعد میں ایک شہر بس گیا جو آج طاریفہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے لشکر نے اس خطے میں چند ہفتے گھوم پھر کر اندازہ لگا لیا کہ اس ملک کو بہ آسانی فتح کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اگلے ہی سال یعنی ۷۱۱ء میں موسیٰ بن نصیر نے سات ہزار سپہ سالاروں کا لشکر اپنے قابل اعتماد جرنیل طارق بن زیاد کی سرکردگی میں روانہ کیا۔

بربری النسل مسلمانوں پر مشتمل یہ لشکر جبل الطارق کے دامن میں اترا۔ یہاں پر ہی طارق نے اپنے جہازوں کو جلانے کا حکم دیا اور اپنی فوج کے سامنے ایک تاریخی اور ولولہ انگیز تقریر کی۔ اللہ کی حمد و ثناء کے بعد اس نے اپنے سپاہیوں کو بتایا کہ دیکھو تمھارے پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن ،لہٰذا بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں اور یہ کہ اب ہماری منزل غازی بننا یا شہید ہونا ہے۔ اس تقریر کا تمام لشکر پر گہرا اثر ہوا اور یہی سات ہزار جانباز جب بعد میں راڈرک کے ایک لاکھ ٹڈی دل لشکر سے ٹکرائے تو اس ملک کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ طارق بن زیاد کی آمد کے بعد تین سال سے بھی کم عرصے میں مسلمانوں نے تقریباً سارا ہسپانیہ فتح کر کے فرانس کے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ اس خطے کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی فرانس اور شمالی ہسپانیہ کے درمیان واقع پہاڑی سلسلہ دونوں ملکوں کے مابین صدیوں سے قدرتی سرحد اور دفاعی دیوار کا کام دیتا چلا آ رہا ہے۔ کچھ تو قدرتی حالات اور کچھ مسلمان جرنیلوں کی جذباتی مگر ناقص منصوبہ بندیوں کے باعث یہاں پہنچ کر ان کی پیش قدمی رک گئی۔ تاہم اگر مسلمانوں کی یہ فتوحات اسی انداز سے جاری رہتیں تو یقیناً آج یورپ کا نقشہ

کچھ اور ہی ہوتا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی طوفانی فتوحات سے بھاگ کر بہت سے عیسائی جنگجوؤں نے ہسپانیہ اور فرانس کے درمیان واقع اسی پہاڑی سلسلے میں پناہ لے لی اور اپنے مذہب کو بنیاد بنا کر یہ تہیہ کرلیا کہ وہ ہر صورت میں اس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ یہیں سے انھوں نے سازشوں اور چھوٹی چھوٹی چھاپہ مار کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں کئی صدیوں تک تسلسل کے ساتھ فروغ پاتا رہا۔ ان کارروائیوں کے نتیجے کا ذکر تو ہم بعد میں کریں گے مگر فی الحال یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے آخر اتنی تندو تیز فتوحات کیوں کر حاصل کیں۔ اس ضمن میں ایک حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم فوج کو مقامی لوگوں کی جانب سے کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں نے یہاں کے مکینوں سے بہت ہی اچھا سلوک کیا۔ کئی مقامی سردار جنھوں نے مزاحمت نہیں کی تھی اپنے اپنے مناصب پر بحال رکھے گئے۔ اسی طرح عوام الناس میں بھی بہت سے لوگوں کی جائیدادیں برقرار رکھی گئیں اور انھیں معمولی جزیہ کی ادائیگی کے عوض مذہبی آزادی، جان و مال اور عزت کا تحفظ دیا گیا۔ مسلمانوں کے اسی حسن سلوک کی بنا پر بہت سے عیسائی آہستہ آہستہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ علاوہ ازیں بہت سے مسلمان مردوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کر لیں۔ رشتے ناتوں کا یہ سلسلہ بھی مملکت اسلامیہ کی مضبوطی اور دوام میں ممدو معاون ثابت ہوا۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر نے جب اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس میں اپنا جانشین مقرر کیا تو کچھ عرصہ بعد ہی اس نے راڈرک کی بیوہ اگیلونا سے شادی کر لی اور اس شادی کے بعد اگیلونا اُمِ عاصم کے نام سے مشہور ہوئی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں اندلس نے ایسی شاندار اور بے مثال ترقی کی کہ

تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی نظیر ملتی ہو۔ اس عہد کی اسی ترقی سے علم وفن کے عروج اور دولت کی ریل پیل کی چند جھلکیاں اگلے ابواب میں ہمارے سفری مشاہدات کے بیان سے واضح ہوتی چلی جائیں گی ۔موضوع کی مناسبت سے یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اس تمام تذکرے سے میرا یہ مقصود ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی کی ان آٹھ صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ میں سب کچھ ہی اچھا تھا۔ درحقیقت اسی عہد میں مسلمان حکمرانوں کی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کئی مواقع پر سیاسی عدم استحکام اور افراتفری کے واقعات بھی وقوع پذیر ہوئے۔ مثال کے طور پر شروع کے عہد ہی کو لیجیے کہ ۷۱۱ء سے لے کر ۷۵۶ء کے درمیان کوئی دو درجن کے قریب حکمران تبدیل ہوئے۔ اس طرح گیارہویں صدی کے وسط سے لے کر ۱۴۹۲ء تک کے عرصے کو بھی بہت حد تک طوائف الملوکی کا دور کہا جاتا سکتا ہے۔ اس عہد میں مسلم سلطنت کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھی جو آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بھاری تاوان کے عوض ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد طلب کیا کرتی تھیں۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عدم استحکام کے دور میں بھی علمی، ادبی اور سائنسی ترقی کا کام کسی نہ کسی صورت میں جاری و ساری رہا۔ تاہم دوسری طرف یہ حقیقت بھی عالمگیر صداقت کی حیثیت رکھتی ہے کہ داخلی عدم استحکام کا تسلسل نہ تو دائمی طور پر علمی وفنی ترقی کے تواتر کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی ریاست کی بقا کو دوام بخش سکتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اندلس میں مسلم عہد کا انجام بھی درحقیقت ایک بہت طویل اور نہایت ہی دردناک داستان ہے جس کی کچھ جھلکیاں آپ آئندہ کی سطور میں دیکھیں گے۔

حال سے ماضی کی طرف سفر

انگلستان سے اندلس کو روانگی کے تذکرے سے قبل میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ دراصل اس خطے کی عظمت رفتہ کے بغور مطالعے سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ ایک افسانوی داستان ہے۔ دراصل یہ افسانہ اس لیے بھی لگتا ہے کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں پر اپنے خزانوں کے منہ اس قدر کھول دیے تھے کہ یہ قوم تو انعاماتِ خداوندی کے معاملے میں غالباً عہد موسوی کے بنی اسرائیل سے بھی بازی لے گئی تھی۔ اس سلسلے میں تاریخ کے ایک طالبعلم ہونے کی حیثیت سے میرے محدود مطالعے کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسی عظیم الشان بادشاہت اور اس عہد کی خوشحالی وفراوانی نہ تو اس کرۂ ارض پر پہلے کبھی پائی گئی تھی اور نہ آئندہ قیامت تک دیکھی جائے گی۔ دراصل نبی اور بادشاہ ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے وہ وقت اور خصوصیات صرف انھی کے لیے مخصوص کر دی تھیں۔ چنانچہ اس مخصوص وقت کو چھوڑ کر اگر یہ کہا جائے کہ روئے زمین پر اندلس جیسی خوشحالی وفراوانی نہ تو انسانیت نے پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ آئندہ کبھی دیکھے گی تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ اسی بنا پر اس خطے کو دنیا پر اللہ کی عطا کردہ جنت کہنا بجا ہوگا۔

اس عہد میں عوام الناس کی خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ لوگ زکوٰۃ وصدقات لیے پھرتے تھے مگر کوئی لینے والا نہ تھا۔ اس زمانے کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پھلوں اور دوسرے میوہ جات کی اس قدر بہتات تھی کہ اگر کوئی عورت گھر سے خالی ٹوکرا سر پر رکھ کر اپنی زمینوں کی طرف روانہ ہوتی تو راستے میں لگے پھلدار درختوں کے نیچے

سے گزرنے پر خود بخود اتنے پھل گر جاتے کہ اپنی زمین تک پہنچتے پہنچتے یہ خالی ٹوکرا بھر چکا ہوتا تھا۔ دراصل سبزیوں اور میوہ جات کی بہتات کی وجہ سے بہت سے لوگ ان کی خرید وفروخت کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ دلچسپ اور حیران کن بات یہ ہے کہ ماضی کے اندلسی افسانوں کو ذہن میں رکھ کر اگر زمانۂ حال کے ہسپانیہ میں مسلمانوں کے چند بچے کھچے آثار کا گہری نظر سے مشاہدہ اور تجزیہ کیا جائے تو یقیناً یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت تھی۔

قارئین کی دلچسپی کی خاطر یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ مذکورہ مطالعاتی دورے کی تجویز وسطی انگلستان کے ایک عیسائی مذہبی رہنما سے میری ملاقات کے دوران سامنے آئی۔ بعدازاں اس نے شمالی انگلستان سے اپنے ایک اور دوست کو بھی اس سفر کے لیے تیار کر لیا۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے علاقوں کے مانے ہوئے علماء سمجھے جاتے ہیں۔ دراصل اس پورے سلسلے میں میری تجویز یہ تھی کہ ہم یہودی مذاہب سے تعلق رکھنے والی کسی عالم فاضل شخصیت کو بھی اپنا رفیق سفر بنالیں تا کہ یہ سفر اولاد ابراہیمی کا ایک کثیرالمذاہبی دورہ بن سکے۔ حسن اتفاق سے اس تجویز کی خوب پذیرائی ہوئی اور اسے عملی جامہ پہنانے کی مقدور بھر کوششیں بھی کی گئیں۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ منصوبہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔ درحقیقت اس سارے معاملے کے درپردہ میری ایک مخصوص سکیم بھی کارفرما تھی۔ میں یہ چاہ رہا تھا کہ آج کے یہود ونصاریٰ خود اس امر کا مشاہدہ کریں کہ عہد وسطیٰ میں اندلسی مسلمانوں نے ان کے آباؤ اجداد کے ساتھ کیسا اعلیٰ درجے کا برتاؤ کیا کہ جس کے نتیجے میں اس دور میں ان دونوں مذاہب کے پیروکاروں کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ اس مسلم عہد نے بے شمار عیسائی اور یہودی علماء پیدا کیے اور انھیں سرکاری اور درباری اعزازات سے نوازا گیا۔ بدقسمتی سے آج کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ خیر بہر حال! یہ تھا

اس کثیر المذاہبی دورے کا حقیقی مقصد اور اب ہم چلتے ہیں اس سفر کے آغاز کی طرف۔

ہمارے اس سفر کا آغاز وسط اکتوبر کی ایک سہانی شام کو مشرقی لندن کے بین الاقوامی ہوائی اڈے سٹینسٹڈ سے ایزی جیٹ فضائی کمپنی کی ایک کم خرچ بالانشین پرواز سے ہوا۔ پروگرام کے مطابق تاریخ کے یہ تینوں طالبعلم مقررہ وقت پر ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھینی بھینی ہوا چلنے کی وجہ سے فضا بہت ہی خوشگوار تھی۔ اسی خوشگوار ماحول میں اپنی نوعیت کا یہ انوکھا اور زندگی کا ایک یادگار سفر ہونے کی وجہ سے تینوں مسافروں کے لیے بڑا جذباتی منظر بھی پیش کر رہا تھا۔ آپ یوں سمجھیے کہ حقیقت میں دل بلیوں اچھل رہا تھا اور اندرونی کیفیت یہ تھی کہ جیسے ہم کچھ دنوں کے لیے آج کی اس جدید مشینی اور افراتفری سے بھرپور اکیسویں صدی کو پیچھے چھوڑ کر قرون وسطیٰ کے اُفق پر موجود انوکھی جنت کے مزے لوٹنے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ زمانہ حال اور ماضی کے درمیان میں حائل کئی صدیوں کے بُعد کو ایک ہی جست میں عبور کر کے عہد وسطیٰ میں اپنے آباء کے محلات و باغات جا پہنچنا بیان سے باہر لگ رہا تھا۔

لندن سے روانگی پر ہماری پہلی منزل ملاغہ کا تاریخی شہر تھا۔ ہوائی اڈے سے ضابطے کی کارروائیوں سے فارغ ہونے پر جہاز کے اندر قدم رکھا اور ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ حسب دستور فضائی میزبان نے سفر کے بارے میں رٹی رٹائی ہدایات زبردستی ہمارے گوش گزار کرنا شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ جہاز نے بھی آہستہ آہستہ سرکنا شروع کر دیا اور چند ہی لمحوں میں رن وے کے کنارے پر جا پہنچا۔ یہاں پر پرواز کے لیے طیاروں کی ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی۔ باری آنے پر ہمارا جہاز بھی فراٹے بھرتا ہوا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ جہاز اور رن وے کے رشتے کے ٹوٹتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرا اب اس اکیسویں صدی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ جوں جوں جہاز لندن سے دور اور ملاغہ سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اسی تناسب سے دل

کی جذباتی کیفیت میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی پونے تین گھنٹے کی اس مسافت کے دوران ہی رات کی شروعات ہو چکی تھیں اور تاریکی نے تمام افق کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ مجھے فضا سے ملاغہ کا شہر دیکھنے کی بہت خواہش تھی تاہم بدقسمتی سے اندھیرے نے میرے شوق اور شہر کی رنگینیوں اور رونقوں کے درمیان ایک گہرا پردہ تان رکھا تھا۔ خیر میں بھی ضد کا پکا ہونے کی وجہ سے اتنی جلدی ہار ماننے والا نہ تھا۔ چنانچہ ملاغہ پہنچنے پر جونہی جہاز نے رن وے پر لینڈ کرنے سے قبل شہر کا ایک فضائی چکر لگایا تو میں نے یہاں کی روشنیوں اور جگمگ جگمگ کرتے برقی قمقموں کے دلفریب مناظر سے مقدور بھر لطف اندوز ہونے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

یہاں موضوع کی مناسبت سے اس بات کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ کئی ہفتے قبل سے ہی ہمارے اس دورے کو نہایت منظم طریقے سے ترتیب دیا گیا تھا اور اس حسن انتظام کا تمام تر سہرا دوسرے دونوں ساتھیوں کے سر ہے۔ خیر ہوائی اڈے سے باہر آنے پر رات کافی ہو چکی تھی۔ ایک متعلقہ ٹرانسپورٹ کمپنی کا میزبان ہمارے استقبال کی خاطر پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلائی اور فرفر ہسپانوی میں چند استقبالیہ جملوں کی ہم پر بوچھاڑ کر دی۔ ہسپانوی زبان سے دور کا واسطہ بھی نہ ہونے کی وجہ سے میرے پلے کچھ نہ پڑا اور گھبراہٹ میں میں دوسرے دونوں ساتھیوں کا منہ تکنے ہی والا تھا کہ ان میں سے ایک نے ہلکے پھلکے انداز میں اس سے بات چیت شروع کر دی۔ میں نے یہ دیکھ کر سکھ کا سانس لیا کہ اچھا ہوا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ اسی اثنا میں اس میزبان نے ہمیں ہمارے سامان سمیت اپنی ویگن میں بٹھایا اور سیدھا اپنی کمپنی کے دفتر میں لے گیا جہاں سے ہم نے آئندہ ایک ہفتے کے لیے ایک کار ڈرائیور کے بغیر کرایہ پر لے لی اور پھر اپنے مقررہ ہوٹل کی راہ لی۔ دراصل ہمیں اس سواری کی وجہ سے آئندہ دنوں کے سفر میں بہت

سہولت اور بچت رہی۔ اسی دوران میں مَیں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہاں دو مسئلے پیش آ سکتے ہیں۔ اول یہ کہ ہسپانیہ میں ٹریفک کا نظام برطانیہ یا پاکستان کے بالکل برعکس ہے یعنی یہاں موٹر گاڑیاں سڑک کے دائیں جانب چلتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس ملک کی آبادی کی واضح اکثریت انگریزی زبان سے بے بہرہ ہے۔ خوش قسمتی سے ان دونوں ساتھیوں میں سے ایک بہت اچھا ڈرائیور جبکہ دوسرا ہسپانوی زبان میں سوجھ بوجھ رکھنے کے علاوہ نقشہ خواندگی میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس صورت حال سے میں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ہمیشہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر مزے سے کبھی ماضی اور کبھی حال کے ادوار میں محو پرواز رہا۔

موجودہ اندلس یعنی جنوبی ہسپانیہ کا علاقہ چار صوبوں پر مشتمل ہے جو اپنی اپنی حدود میں واقع چار بڑے اور تاریخی شہروں کے نام سے منسوب ہیں۔ ملاغہ اس علاقے کا جنوبی صوبہ ہے جبکہ دیگر تین صوبے اشبیلیہ، قرطبہ اور غرناطہ ہیں۔ ملاغہ ہسپانیہ کا غالباً سب سے چھوٹا صوبہ ہے تاہم تیزی سے ترقی کرتی ہوئی سیاحت کی صنعت کی وجہ سے اس کی آبادی اور کاروباری سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بحیرہ روم کے دہانے پر واقع ملاغہ شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور کٹا پھٹا ساحل ہونے کی وجہ سے یہ شہر ایک قدرتی بندرگاہ کا منظر پیش کرتا ہے۔ گرمیوں میں سیاحوں کی آمد کے باعث ساحل سمندر پر خوب رونق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس موسم میں سیاحت کی وجہ سے یہاں کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی خوب مصروف رہتا ہے۔

ملاغہ کا شہر کوئی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ اپنے سینے میں سموئے ہوئے ہے، اگرچہ اوائل قیام سے ہی یہ شہر صنعت و حرفت اور تجارت کا مرکز رہا ہے مگر مسلمانوں کی آمد کے بعد اس نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہاں کے

مقامی مسلمان حکمران یوسف اول نے یہاں ایک مضبوط دفاعی قلعہ تعمیر کیا۔ لیکن بدقسمتی سے پندرھویں صدی کے اواخر میں یہ شہر عیسائیوں نے فتح کر لیا اور مسلمان آبادی کا خوب قتل عام کیا۔ ان کی جائیدادیں یا تو ضبط کر لیں گئیں یا پھر ان کو آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح شہر کی جامع مسجد میں ردوبدل کر کے اسے کلیسا بنا دیا گیا۔ درحقیقت گردش زمانہ ملکوں، شہروں اور حتیٰ کہ تہذیبوں کے خدوخال کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ یہی کچھ ملاغہ میں ہوا۔ یہاں یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے مسلمان ملاغہ اور اکیسویں صدی کے عیسائی ملاغہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عہد اسلام میں ملاغہ باغات اور عمارتوں کا شہر کہلاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو یہاں سے بے دخل کرنے کے بعد عیسائیوں نے ان کی باقیات کا بھی صفایا کر دیا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں دو چیزوں کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی اور خاص علامت نظر نہیں آتی۔ ان دو علامتوں میں سے ایک تو شہر میں کہیں کہیں پائے جانے والے کھجور کے درخت اور دوسرا مسلمانوں کے تعمیر کردہ قلعے کے درودیوار ہیں جو ہر آنے والے کو ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا کر روانہ کر دیتے ہیں۔ اسلام آباد کے دامن کوہ کی طرح جبرالفرو کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے یہاں سے شہر اور آس پاس کے علاقے کا بہت ہی دلچسپ نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے تو ہمارے لیے اس شہر میں مزید کوئی خاص دلچسپی باقی نہ تھی البتہ مشہور عالم ہسپانوی مصور پکاسو کے عجائب گھر میں اس کی مصوری کے شاہکار دیکھنے کو دل ضرور مچلتے تھے جن کا دیکھنا ہم نے اپنی واپسی کے دن تک موخر کر دیا۔ دراصل یہاں آمد کی طرح ہماری روانگی کی پرواز بھی اسی شہر سے ہی تھی۔

ملاغہ کا شہر ہماری اندلسی سیاحت کی پہلی کڑی تھی۔ یہاں اپنے مختصر قیام کے دوران ہی آٹھ صدیوں پر محیط شاندار مسلم تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک اور ذلت آمیز اختتام

دیکھ کر دل خون کے آنسو رویا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں سے نکلنے پر ابھی ان کے قدموں کی خاک ہوا میں اڑ ہی رہی تھی کہ عیسائی حکمرانوں نے ان کی دیگر باقیات کے علاوہ عربی زبان کا بھی صفایا کر دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ تاہم یہ سب کچھ کرنے کے باوجود آج کی جدید ہسپانوی زبان میں بھی عربی کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ بہر حال ملاغہ میں اسلامی ثقافت کا صفایا دیکھ کر میرے لیے اب یہاں مزید قیام محال تھا، اور اسی بنا پر مجھے بھی اپنے آباء کی طرح یہاں سے اپنا بوریا بستر گول کرنے کی بہت جلدی تھی۔

جبل الطارق کو روانگی

اندلس کے اس دورے کے دوران مجھے تین چیزیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ان تینوں میں سے سب سے پہلا نمبر آتا ہے جبل الطارق کا دوسرے نمبر پر جامع قرطبہ اور تیسرے نمبر پر الحمرا کے محلات۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں ہماری اگلی منزل جبل الطارق ہے۔ میرے فیصلہ کن انداز کو دیکھ کر دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ سامان کو کار میں ٹھونسنے کے بعد ان میں سے ایک نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی جبکہ دوسرا ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو کر لمبے چوڑے نقشے پھیلائے نیوی گیٹر کے فرائض انجام دینے کی خاطر پر تولنے لگا۔ میں نے پچھلی دونوں سیٹوں پر قبضہ کرتے ہوئے انھیں کہا کہ اب آپ لوگ جانیں اور آپ کا کام، میں ماضی میں غوطے کھانے جا رہا ہوں لہٰذا جبل الطارق پہنچنے تک مجھے واپس نہ بلایا جائے۔

ملاغہ سے جبل الطارق کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے تاہم شوق کی شدت میں مسلسل اضافے کی وجہ سے یہ دو گھنٹے مجھے دو مہینے لگے۔ دراصل یہاں میں وہ جگہ دیکھنے کے لیے بہت بے تاب تھا جہاں کوئی تیرہ سو برس قبل ہمارا اعظیم سپہ سالار اترا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں قدم رکھتے ہی اس جرنیل نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہمارے تمام جہاز جلا دیے جائیں تاکہ واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ یہیں اپنی تاریخی تقریر میں اس نے اسلامی لشکر سے کہا کہ تمھارے پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن اور یہ کہ ہم یہاں واپسی کے لیے نہیں اترے بلکہ اب یہی ہمارا وطن ہے۔ بلاشبہ اس تاریخی واقعے نے آئندہ کی آٹھ صدیوں کے لیے اس ملک کی کایا ہی پلٹ دی۔

جبل الطارق کو انگریزی میں جبرالٹر کہا جاتا ہے جو بلاشبہ جبل الطارق ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اپنی ہیئت اور ساخت کی بنا پر جبل الطارق قدرت کا ایک انمول شاہکار ہے۔ سمندر کی طرف سے یہ چھوٹی سی پہاڑی دیوار کی طرح بالکل سیدھی اوپر اٹھتی ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً پانچ کلومیٹر، چوڑائی دو کلومیٹر اور اونچائی پانچ سو میٹر ہے۔ اپنی تاریخی حیثیت، جغرافیائی محل وقوع اور بالخصوص انوکھی ساخت کی وجہ سے یہ پہاڑی پوری دنیا کے سیاحوں کے لیے بہت ہی پرکشش مقام کا درجہ رکھتی ہے۔ حال ہی میں بعض تاریخی نوادرات کی دریافت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جگہ زمانۂ قبل از تاریخ ہی سے انسانی مسکن رہی ہے۔ ۷۱۱ء میں طارق بن زیاد کی آمد سے لے کر پندرھویں صدی کے وسط تک یہ پہاڑی مسلمانوں کے زیر قبضہ رہی۔ تاہم اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز سے اب تک یہ برطانوی نو آبادی چلی آ رہی ہے۔

ہم ملاغہ سے صبح کا ناشتہ کرنے کے فوراً بعد ہی روانہ ہو گئے تھے۔ ساحل سمندر کی متوازی پہاڑیوں کے بیچوں بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی کشادہ سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی ہماری کار جبل الطارق کی طرف رواں دواں تھی۔ اس دوران میں میرا ذہن کبھی حال اور کبھی ماضی کے ادوار میں شٹل کی طرح ادھر اُدھر آ جا رہا تھا۔ دوران سفر جو چیز میں نے بالخصوص نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اندلس کی ساحلی پٹی کم اونچائی کی خوبصورت اور سرسبز وشاداب پہاڑیوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سیاحت کے لیے بہت موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا سے ہر سال لاکھوں سیاحوں کی آمد سے اس علاقے نے خوب ترقی کی ہے۔ کار میں بیٹھے بیٹھے مجھے ایک دو مقامات پر عہد وسطیٰ کی قدیم اندلسی تعمیرات کے چند آثار بھی نظر آئے جو دل کی جذباتی کیفیت میں مزید اضافے کا سبب بنے۔ اپنے اس سفر کے اختتام پر ہم ''لا لینئے'' کے قصبے میں جا پہنچے جو سپین کا آخری سرحدی قصبہ ہے اور جبل الطارق سے ملحق ہے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ یہیں پر زیر زمین ایک

کار پارک میں کار کھڑی کر کے پیدل سڑک عبور کی جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جبل الطارق میں جگہ کی تنگی کی بنا پر کار کھڑی کرنا بہت دشوار تھا۔ کار پارک سے چند منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم برطانیہ اور ہسپانیہ کی سرحد پر آ پہنچے۔ اگرچہ پاک و ہند کے واہگہ بارڈر کی طرح یہاں جذباتی یا رقت انگیز مناظر تو بالکل ناپید ہیں مگر پھر بھی یہ جگہ سیاحوں کے لیے کسی طرح بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ میں اپنی زندگی کے ان یادگار لمحات میں کیا دیکھتا ہوں کہ جبل الطارق جسے انگریزی زبان میں ''چٹان'' کے نام سے پکارا جاتا ہے سمندر کا سینہ چیر کر آگے بڑھی ہوئی ہے۔ بلاشبہ تاریخ اور جغرافیے کے پس منظر میں اسے یورپ کی چونچ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ جبل الطارق اور سپین کو خشکی کا ایک نہایت تنگ راستہ ملاتا ہے جسے زیادہ تر لوگ پیدل ہی عبور کرتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ دنیا کی اس چھوٹی سی جگہ پر بحیرہ روم اور بحیرہ اوقیانوس کو ملانے والی آبنائے بھی موجود ہے اور برطانیہ اور ہسپانیہ کو ملانے والی خاکنائے بھی۔ اسی خاکنائے پر چند قدم چلنے کے بعد ہم بین الاقوامی سرحد پر آ پہنچے۔ یہاں پر عموماً امیگریشن کا مرحلہ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا سرحدی گیٹ عبور کرتے ہوئے عموماً ہر سیاح کا ایک قدم ہسپانیہ میں ہوتا ہے جبکہ دوسرا برطانیہ کی سرزمین پر۔

سرحدی گیٹ عبور کرتے ہی میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک چھوٹا سا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے اور اس کا رن وے خاکنائے کو چیر کر اور سمندر کی نشیبی جگہ کی بھرائی کر کے بنایا گیا ہے۔ جہازوں کے کھڑے ہونے کے لیے یہاں پر عام ہوائی اڈوں کے برعکس اسی رن وے سے جڑا ہوا ایک درمیانے سائز کا پختہ میدان تعمیر کیا گیا ہے جسے آپ اردو میں ''فضائی صحن'' یا پنجابی میں ''ہوائی ویہڑہ'' کہہ سکتے ہیں۔ اسی سے ملحق انتظامی امور سے متعلقہ چند کمرے بنے ہوئے ہیں۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ اسی فضائی صحن میں دور سے آئے ہوئے دو تین جہاز بھی اونگھ رہے تھے۔

یہ منظر کچھ یوں لگ رہا تھا گویا کہ جیسے چند پنچھی تھوڑی دیر ستانے کی خاطر زمین پر اتر آئے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھنے کے لیے ہمیں رن وے کو پیدل عبور کرنا تھا۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہاں پر آپ کی تشریف آوری خواہ ہوائی جہاز سے ہو یا بحری جہاز سے یا پھر ہماری طرح سپین سے پیدل مارچ کرتے ہوئے آرہے ہوں، آپ کو اس رن وے کو ہر صورت عبور کرنا ہوگا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ غالباً یہ دنیا کا واحد بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہے جس کے گرد چار دیواری یا خاردار تار موجود نہیں۔ میں رن وے کے بالکل اوپر کھڑے ہوئے آنکھیں مسلتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ کرۂ ارض کے اس چھوٹے سے نقطے پر قدرت کی کرم نوازی اور انسانی محنت نے کیا کچھ یکجا کر دیا ہے۔ میرے بائیں طرف چھوٹا سا ہوائی اڈہ جبکہ دائیں طرف ایک بہت بڑی بین الاقوامی بندرگاہ ہے۔ گویا کہ ایک ہی جگہ پر کھڑے کھڑے اپنے سامنے میں بحری جہاز بھی دیکھ رہا ہوں اور ہوائی جہاز بھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جبل الطارق بھی میرے سامنے ایک طرف سے سیدھی آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی دیوار نما پہاڑی ہے۔ یہاں ملحقہ سمندر کی مرطوب ہوائیں سامنے کی طرف سے چٹان کے ساتھ سیدھی ٹکرا کر اوپر کی طرف اٹھتی ہوئی فوراً ہی بادلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اور مجھے یہ دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی کہ پھر یہی بادل ذرا نیچے آکر سمندر کے پانی سے شیر و شکر ہو جاتے۔

انھی بادلوں کے بیچوں بیچ آبنائے سے گزرتے ہوئے بیسیوں بحری جہاز بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کی نصف سے زیادہ تجارت اسی آبنائے کے ذریعے ہوتی ہے اور سالانہ اسی ہزار بحری جہاز یہاں سے گزرتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کردہ برطانوی فوجی اڈہ اور ریڈار کے علاوہ مسلم دور حکومت میں بنایا گیا پُر شکوہ قلعہ بھی مجھے اپنے سے نظریں ہٹانے نہیں دیتا۔ میں چشم تصور سے اس

قلعے پر ماضی میں اسلامی پرچم لہراتا ہوا دیکھ رہا ہوں اگرچہ آج یہاں یونین جیک لہرا رہا ہے۔ یہی قلعہ جو کبھی سلطنت اسلامیہ کی شوکت وسطوت کی حفاظت اور بین الاقوامی تجارت میں مسلم برتری برقرار رکھنے میں ممدومعاون تھا آج اپنی اصلی حیثیت کھو چکا ہے۔ اس کے برعکس پہاڑ کی چوٹی پر نصب شدہ برطانوی ریڈار اور یہاں موجود ان کے بری، بحری اور فضائی فوجی مراکز اس علاقے میں دور دور تک نظر رکھے ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہاں پر کھڑے کھڑے میں قدیم درختوں اور نباتات کے علاوہ جدید زمانے کی متعدد دیگر اشیاء کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یہاں پر دنیا کی تیز ترین کیبل کار بھی نظر آ رہی ہے جو نہایت مستعدی سے پہاڑی کے دامن سے سیاحوں کو اٹھا کر چوٹی پر پہنچا دیتی اور پھر اسی انداز سے انھیں واپس لاتی ہے۔

بلاشبہ دنیا کے کسی بھی ہوائی اڈے کے رن وے پر کھڑے ہو کر یہ نظارہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فوراً ہی زمانۂ حال اور عہد ماضی کی بھول بھلیوں میں ایسا گم ہوا کہ خبر ہی نہ رہی کہ کہاں کھڑا ہوں۔ میرے تصورات کے تار اس وقت ٹوٹے جب ایک ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ بھئی آگے بھی چلنا ہے یا پھر یہیں کھڑے کھڑے کسی ہوائی جہاز کا راستہ روکنے یا بحری جہاز کے آگے بند باندھنے کا ارادہ ہے۔ خیر ذرا آگے بڑھنے پر ہم تینوں نے ارادہ کیا کہ آج جبل الطارق کو پیدل ہی فتح کرنا ہے۔ سرسبز و شاداب اور قدرتی حسن سے مالا مال اس پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی سڑکوں کو روندتے ہوئے ہم چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ یہاں چاروں طرف دُور میلوں تک پھیلا ہوا سمندر اور خشکی کا نظارہ بھی بیان سے باہر ہے۔ یہیں سے ایک راستہ سینٹ مائیکل کی غار کی طرف جاتا ہے۔ ہزاروں سال قبل یہاں بسنے والے قدیم باشندوں کا عقیدہ تھا کہ یہ پہاڑی بیچ سے خالی ہے۔ یہ غار دوسری جنگ عظیم میں بمباری سے محفوظ فوجی ہسپتال کے طور پر بھی استعمال ہوتی رہی تھی۔ پہاڑی کے بیچوں بیچ نیچے اترتی ہوئی یہ غار ایک زیر زمین

جھیل پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

دن کا بیشتر حصہ اس پہاڑی پر پیدل چل کر ہم نے اس کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر میری تڑپ ابھی باقی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ جگہ دیکھنا ابھی باقی تھی جہاں طارق بن زیاد اترا تھا۔ اس وقت دن کا زیادہ حصہ گزر چکا تھا اور طویل پیدل مسافت کے بعد تھکاوٹ بھی تھی۔ چنانچہ یہ چھوٹا سا قافلہ ایک مقامی بس پر سوار ہوا اور پہاڑی کے بالکل دوسری جانب یعنی مراکش کی طرف ایک وسیع و عریض میدان میں جا اترا۔ کہتے ہیں کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں مسلم لشکر اترا تھا۔ میں نے اپنی روحانی پیاس بجھانے کی خاطر یہاں اترتے ہی یہ معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ طارق بن زیاد اس وسیع جگہ کے کس حصے میں اترا تھا اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کس جگہ پر خطاب کیا تھا۔ مگر صد افسوس مسلمانوں کی بے حسی بھی قابل ماتم ہے کہ آج یہاں پر کوئی ایسا کتبہ یا علامت موجود نہیں جو اس تاریخ ساز لمحے کی نشاندہی کر سکے۔ بلکہ اس کے برعکس ۱۹۹۷ء میں سعودی حکومت نے اس جگہ کے ایک کونے میں چھوٹی سی مسجد تعمیر کرا دی ہے۔ دراصل جبل الطارق کی آبادی سے یہ جگہ بہت فاصلے پر واقع ہے۔ ویرانے میں ہونے کی وجہ سے یہ مسجد ہر وقت خالی رہتی ہے۔ میں نے مسجد کے اندر جانا چاہا تو گیٹ پر لگے ایک بڑے تالے نے میرا منہ چڑانا شروع کر دیا۔ تالا دیکھ کر میں واپس لوٹ رہا تھا کہ اتفاقاً مؤذن سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے مختصر سی بات چیت پر معلوم ہوا کہ یہاں نمازیوں کی تعداد بالعموم دو ہوتی ہے۔ یعنی ایک سرکاری امام اور دوسرا سرکاری مؤذن۔

اب یہ سارا افسوسناک منظر نامہ دیکھ کر اس جگہ کو دیکھنے کی میری عمر بھر کی آرزو آناً فاناً ملیا میٹ ہو گئی۔ میرے جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ ماضی و حال کے اس ستم رسیدہ ملاپ کو الفاظ کی قید میں لانا بالکل ناممکن تھا۔ میں نے اپنے آپ کو طفل تسلی دینے کی خاطر آبنائے کی دوسری جانب مراکش کے جزائر پر نظر ڈالی۔ مطلع صاف ہونے کی وجہ

سے دس بارہ میل دوری پر واقع یہ جزائر صاف نظر آ رہے تھے۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی خاطر میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ طارق وہاں سے روانہ ہوا تھا اور یہاں پر اترا تھا۔ میں نے اس خود ساختہ اور کھوکھلے اطمینان کے بعد یہاں چند تصاویر بنائیں اور جعلی تسلی و حقیقی مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نے جبل الطارق کی تسخیر کر لی ہے لہٰذا اب یہاں سے کوچ کرو۔

واپس لوٹتے ہوئے میں نے آخری بار اس وسیع اور تاریخی میدان پر نظر ڈالی اور اپنے قافلے کے ساتھ پیدل مارچ کرتے ہوئے دوبارہ پھر ہوائی اڈے کے اسی رن وے کو عبور کیا اور نہایت صفائی کے ساتھ ''فضائی صحن'' سے اپنا پلو بچا کر تارکین وطن کے دفتر آ پہنچا۔ یہاں سے چند ہی لمحوں میں ضابطے کی کارروائی پوری کر کے ایک بار پھر ہم نے برطانیہ سے ہسپانیہ میں قدم رکھ دیا۔ اس وقت شام ہوا چاہتی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے اس سفر کی دوسری مگر انتہائی اہم کڑی بھی جیسے تیسے تکمیل کو پہنچی۔ ہسپانوی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے میر کارواں سے کہا کہ اب سواری کی لگام کس لی جائے تاکہ ہم سب اللہ کا نام لے کر یہاں سے جلد روانہ ہو جائیں۔

اشبیلیہ میں آمد

جبل الطارق سے روانگی پر ہماری منزل مقصود اشبیلیہ کا تاریخی شہر تھا جو یہاں سے کوئی ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ اشبیلیہ کو انگریزی میں سی وِل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کار میں بیٹھنے پر حسب ضابطہ ہمارے میر کارواں نے ڈرائیونگ کی ذمہ داری لی جبکہ دوسرا ہسپانوی زبان کی لغت کھول کر بعض ضروری اصطلاحات رٹنے رٹانے میں مشغول ہو گیا۔ میں گذشتہ صبح کے سفر کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ماضی و حال کے ادوار کے درد بھرے تصادم میں گم ہو گیا۔ دوران سفر دائیں بائیں کے مناظر وسیلہ ظفر سے کم نہ تھے۔ اشبیلیہ پہنچ کر ہوٹل کو تلاش کرتے کراتے رات ہو چکی تھی۔ وقت کی نزاکت سے اب کھانا اور آرام ہماری اولین ترجیح تھی۔ گذشتہ دن کی تھکاوٹ اور رات گہری نیند سونے کے باوجود صبح صادق کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ نہا دھو کر نماز فجر ادا کی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کی کہ جبل الطارق کی طرح یہاں کوئی ذہنی اذیت نہ اٹھانی پڑے۔ تاہم من حیث القوم ہمارے موجودہ دور کے مسلمانوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو شاید اس شہر میں بھی میری آزمائش مقصود تھی جس کی بناء پر یہاں بھی بعد میں مجھے خون کے گھونٹ پینے پڑے۔ خیر اس بات کا تذکرہ تو تھوڑی دیر بعد ہوگا پہلے میں یہ بیان کرتا چلوں کہ مسلمانوں کے عہد میں اشبیلیہ اسلامی علوم وفنون کا ایک بہت ہی اہم مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس شہر نے مسلمانوں کے علاوہ لاتعداد عیسائی و یہودی علماء و حکماء بھی پیدا کیے جنھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں یدطولیٰ رکھنے کی وجہ سے انسانیت کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ غور کریں کہ اس شہر کا غیر مسلم علماء کو پیدا کرنا

درحقیقت مسلمانوں کی فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تاہم آج ستم ظریفی یہ ہے کہ یہی شہر علم و حکمت کے گہوارے کی بجائے شراب و کباب کا اہم مرکز سمجھا جاتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل اشبیلیہ یورپ میں عیسائیت کی تعلیم و تبلیغ کا ایک بڑا مرکز تھا۔ طارق بن زیاد نے یہ شہر اندلس میں اپنی آمد کے اگلے ہی سال فتح کر لیا تھا اور اس ابتدائی دور میں کچھ عرصے کے لیے تو یہ اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بھی رہا۔ بلاشبہ یہاں مسلمانوں نے اپنی موجودگی کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ نہ صرف اس شہر میں فن تعمیر بلکہ مقامی ہسپانوی زبان کے لہجے میں عربی کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس شہر کی وسعت اور اس کے وسط میں ایک دریا بہنے کی وجہ سے مسلمان اسے وادیٔ الکبیر کے نام سے پکارتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آج بھی اس دریا کا نام گوادلقویر ہے جو درحقیقت وادیٔ الکبیر ہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں تو یہ شہر اپنی ترقی اور خوشحالی کی معراج پر تھا۔ غالباً یہی خوشحالی اور مسلمانوں کی داخلی کمزوریاں عیسائی حکمرانوں کے لیے کشش کا باعث بنیں اور انھوں نے ۱۲۴۸ء میں اسے فتح کر کے اپنا دارالحکومت بنا لیا۔

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ نئے اور انوکھے طرز تعمیر کی عمارتیں تعمیر کرنا، باغوں، درسگاہوں اور عوامی حماموں کا قیام ہمیشہ ہی مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے۔ بلاشبہ یہی امر اشبیلیہ پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۱۷۲ء میں اس شہر میں ایک وسیع و عریض اور عظیم الشان مسجد کی تعمیر کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس مسجد کے مینار کو تکمیل کے مراحل طے کرتے کرتے مزید چھبیس سال لگ گئے۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے یہ مسجد مراکش کی قطبیہ مسجد اور استنبول میں واقع خلافت عثمانیہ کے دور کی مسجد سلیمانیہ سے

کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ اگرچہ مسجد سلیمانیہ صدیوں بعد تعمیر ہوئی مگر قرائن بتاتے ہیں کہ عثمانی ماہرین تعمیرات اندلسی ماہرین تعمیرات سے یقیناً متاثر و مستفید ہوئے ہوں گے۔ بدقسمتی سے اس مسجد کے مینار نے ابھی اپنی عمر کے پچاس سال بھی پورے نہ کیے تھے کہ یہاں عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے اس پوری عمارت میں ایسا ردوبدل کیا کہ اس کا حلیہ بگاڑ کر اسے کلیسا میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کا نام سینتا ماریا کا کلیسا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک مسلم عمارت کو عیسائی بنانے کی خاطر اس میں اتنی زیادہ تعمیراتی ملاوٹ کی گئی ہے کہ عام آدمی کے لیے اصل و نقل کی پہچان تقریباً ناممکن ہو کر رہ گئی ہے۔ مسجد کے مینار کو بھی اوپر سے تبدیل کر کے کلیسا کا مینار بنا دیا گیا ہے اور اس کے اندر مسلسل بہت بڑی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔

ہم تینوں مسافر اس کلیسا کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ میں نے ذاتی طور پر اب تک جو کچھ بھی دیکھا تھا اسے مصنوعی طور پر ہضم کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر اب میرے لیے یہ دیکھنا مزید بھی مشکل ہو رہا تھا کہ اس عمارت کی بہت بڑی محراب اور مینار کو مکمل طور پر عیسائیت کے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی دو ایسی چیزیں ابھی باقی ہیں جو سابقہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کی ہلکی سی جھلک پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو مینار کے اندر داخلے کی جگہ پر لگی ہوئی عربی زبان میں تحریر کردہ تختی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اسے تعمیر کرنے والے مسلمان ماہر کا نام ابو یوسف یعقوب تھا۔ اسی طرح یہاں کا داخلی دروازہ نہ صرف بہت حد تک ابھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے بلکہ اس پر بارھویں صدی کی عربی خطاطی بھی ہر سیاح کو مسلم ماضی کی ایک کرن دکھا دیتی ہے۔ ان مذکورہ علامتوں کے علاوہ پوری عمارت کے اندر مزید کوئی اسلامی نشانی نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کے برعکس عمارت کا اندرونی حصہ مکمل طور پر عیسائیت کی عکاسی کرتا ہے اور جابجا مجسمے اور عیسائی مذہب سے متعلقہ اشیاء دکھائی دیتی ہیں۔

اپنی اس سابقہ عبادت گاہ میں ایک اور چیز دیکھنا بھی مجھے بہت ہی گراں گزرا اور وہ تھا عمارت کے ہال کے اندر موجود کولمبس کا مقبرہ۔ دراصل یہ ۱۴۹۲ء کا سال تھا جب عیسائی ملکہ ازابلا اور شاہ فرنیندو نے اندلس میں مسلمانوں کے آخری شہر غرناطہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اسی سال شاہ اور ملکہ نے کرسٹوفر کولمبس کو اپنے دربار میں طلب کر کے ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے کی خاطر روانہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اندلس سے مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد ان عیسائی حکمرانوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ اب وہ ہندوستان میں قائم وسیع مسلم سلطنت کی لوٹ مار کے خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اندلس کے مشرق میں واقع سلطنت عثمانیہ کی موجودگی اور دبدبے کی وجہ سے ملکہ ازابلا اور شاہ فرنیندو اس طرف منہ کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے جس کی بنا پر انھوں نے باہر ہی باہر سے کوئی نیا سمندری راستہ تلاش کرنے کی خاطر کولمبس کو یہ ذمہ داری سونپی۔ آخر کار اس کوشش میں پھرتا پھراتا وہ جزائر غرب الہند جا پہنچا۔ بہر حال عجیب بات یہ ہے کہ اس کلیسا میں کولمبس کا مقبرہ بھی کچھ انوکھی نوعیت کا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس کے جسد خاکی کو ایک تابوت میں بند کر کے اس عہد کے چار مقامی عیسائی ریاستی حکمرانوں کے مجسموں کے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ سارا منظر دیکھ کر مجھے اب عمارت کے اندر مزید کچھ دیکھنے کی بالکل طلب نہ رہی۔

عمارت سے باہر نکل کر میں نے ایک بار پھر اس کے فن تعمیر پر طائرانہ نظر ڈالی اور اصل و نقل کو پرکھنے کی کوشش کے دوران میری آنکھیں بے ساختہ مینار کی چوٹی پر جا ٹھہریں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا بالائی حصہ مکمل طور پر تبدیل شدہ ہے اور چوٹی کے اوپر دھاتی ہلال کی اسلامی علامت کی بجائے عیسائیت کا ایک چھوٹا سا مجسمہ جڑ دیا گیا ہے۔ اسی مجسمے کے نیچے والی منزل پر پیتل کی بہت بڑی گھنٹی لگی ہوئی ہے جس کی ٹن ٹن دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ یہ سارا منظر نامہ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی کل ہی کی

بات تھی کہ جب اسی مینار سے مؤذن مجھے اذان کی سہانی آواز سنایا کرتا تھا۔ اسی اذان کو سن کر میں فوراً مسجد جا پہنچتا اور اس کے حوض میں بھرے صاف وشفاف اور چمکدار پانی سے وضو کیا کرتا تھا۔ دوران نماز ہمارے امام صاحب بھی کیا ہی محسور کن انداز میں قرآن حکیم کی چند آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم سب نمازی ایک دوسرے سے ملتے اور باہمی امور سے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ یہیں نماز کے بعد کئی بار میری ملاقات اپنے ایک عظیم بزرگ عالم اور مشہور ماہر نباتیات ابوزکریا العوام اشبیلی سے ہو جایا کرتی تھی۔ اشبیلی صاحب نے نباتات کی چھ سونئ قسمیں دریافت کرنے کے علاوہ پودوں کے پیوند کاری کے کئی نئے طریقے بھی ایجاد کیے۔ زراعت و باغبانی میں میری ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہم گھنٹوں اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے اور میں ان کے علم وحکمت سے فیض یاب ہو کر اپنی پیاس بجھاتا رہتا۔ مگر افسوس کہ اب نہ وہ مؤذن ہیں اور نہ ہی ہمارے امام مسجد۔ اب تو یہاں مجھے نہ کوئی نمازی نظر آتا ہے اور نہ ہی ہمارے بزرگ اشبیلی صاحب کا کچھ پتہ ہے۔ خیر دوسروں کے بارے میں تو کیا کہنا مجھے خود اپنی بھی خبر نہیں۔ بلاشبہ میں آج وہ نہیں رہا جو کل ہوا کرتا تھا۔

اشبیلیہ میں دریائے گوادالقویر کے کنارے ایک بہت ہی جاذب نظر گول شکل کا قلعہ نما مینار ہے جسے ہسپانوی زبان میں ٹورے ڈل آرو یعنی سونے کا مینار کہا جاتا ہے۔ یہ مینار ۱۲۲۱ء میں مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس کے بالمقابل دریا کے دوسرے کنارے پر بھی ایک مینار تعمیر کیا گیا تھا جو دست برد زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے۔ اس قلعہ نما مینار کی خاص بات یہ تھی کہ دشمن کے کسی ممکنہ حملے کی صورت میں یہاں دریا کے آر پار کے میناروں سے لوہے کی زنجیر باندھ دی جاتی تھیں تاکہ دشمن کے بحری جہازوں کا راستہ روک کر انھیں آگے بندرگاہ کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ مسلمانوں کے ہسپانیہ سے نکلنے کے بعد جب اس ملک نے دنیا کے دور دراز علاقوں

میں اپنا نو آبادیاتی نظام قائم کیا تو وہاں سے لوٹا ہوا سونا اور ہیرے جواہرات اسی مینار کے اندر محفوظ کیے جانے لگے۔ اس مینار کے قریب ہی دریا پر تعمیر کردہ ایک تاریخی پُل بھی قابل دید ہے۔

دراصل اندلسی مسلمانوں کے تذکرے کے دوران اگر ان کے ذوق باغبانی کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ اشبیلیہ تو خاص طور پر اپنے باغات کی وجہ سے بھی بہت مشہور تھا اور انھی باغات کی کچھ باقیات آج بھی عہد وسطیٰ کی یاد دلاتی ہیں۔ اشبیلیہ کے زیریں علاقہ میں تو میلوں تک صرف باغات ہی باغات تھے۔ یہاں زمین کی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر مسلمان ماہرین نباتات نے ہزاروں قسم کے نئے پودے لگائے۔ بلکہ حیران کن بات یہ ہے کہ یہاں تقریباً تمام روئے زمین کے پودوں اور پھلوں کو اُگایا گیا تھا۔ اسی طرح جو جڑی بوٹیاں ہمالیہ کے دامن کے سوا کہیں بھی نہ اُگ سکتی تھیں یہاں بڑی کامیابی سے کاشت کی گئیں۔

اشبیلیہ میں شاہی محل ''القصر'' جسے ہسپانوی زبان میں القازار کہتے ہیں بھی نہایت قابل دید ہے۔ درحقیقت فن تعمیر کا نادر نمونہ ہونے کی وجہ سے یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کئی عمارتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ آٹھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا اور بعد کے وقتوں میں اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اگرچہ بعد کے عیسائی حکمرانوں نے بھی اس میں متعدد اضافے اور ردوبدل کیے مگر وہ اس کی اصلیت کو کلی طور پر تبدیل نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی یہاں کے کشادہ ہال، دربار، پانی کے فوارے، باغیچے اور سرسبز راہداریاں فوراً ہی سیاحوں کے اذہان وتصورات کو قرون وسطیٰ کے اندلس میں پہنچا دیتی ہیں۔ یہاں دیواروں پر کی گئی دیدہ زیب مصوری وقلمکاری اور ٹائلوں کی بناوٹ و چمک دمک بیان سے باہر ہے۔ اس محل میں بادشاہوں، امراء اور سفراء کے لیے علیحدہ علیحدہ ہال تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان

ہالوں کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لیے لکڑی کا کام بھی اس اعلیٰ انداز سے کیا گیا ہے کہ روئے زمین پر اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہر عمارت کے باہر خوبصورت باغیچے بھی بنے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ یہ سارا ماحول انتہائی خوبصورت اور مسحور کن ہے۔ القازار میں سیاحوں کی بے پناہ کشش اور رش کے باعث یہاں کا دورہ ایک گروپ کی صورت میں گائیڈ کے ذریعے منظم انداز میں کرایا جاتا ہے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ اندلس میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ اکثر بڑی بڑی عمارتوں خصوصاً مساجد ومحلات میں قرآنی آیت "ولا غالب الا اللّٰہ" کی خطاطی سے مزین ٹائلیں دیواروں اور محرابوں پر استعمال کرنے کا بہت رواج تھا۔ القازار کی شان وشوکت کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمارا گروپ جب ایک ہال میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہی ٹائلیں دیواروں کے بجائے فرش پر لگی ہوئی ہیں۔ کچھ آگے بڑھنے پر ایسی ہی مقدس ٹائلیں چند اور جگہوں اور راہ داریوں میں بھی نظر آئیں اور میری آنکھوں کے سامنے درجنوں سیاح مٹکتے ہوئے اوپر سے گزر گئے اور کسی کو کوئی خبر نہیں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا رنگ فق ہو گیا اور دل خون کے آنسو رونے لگا۔ کلام اللہ کی یہ حالت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے غصے سے خاتون ٹور گائیڈ سے اس بات پر سخت احتجاج کیا۔ خیر اس بیچاری کی تو حیثیت ہی کیا تھی کیونکہ وہ تو خود معمولی سی ملازمہ تھی۔ اس نے میری بات آئیں بائیں شائیں کر دی۔ دراصل اس سارے معاملے میں ہوا یہ کہ موجودہ سپین کے بعض بدبخت منتظمین نے جان بوجھ کر یہ ٹائلیں کہیں اور سے اکھاڑ کر دانستہ طور پر اس محل کی مرمت اور تزئین و آرائش کی آڑ میں مسلمانوں کی تذلیل کی خاطر فرش پر لگا دیں تاکہ ہر سال ہزاروں لاکھوں لوگ انھیں اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے گزریں۔ مجھے دکھ اس بات کا بھی تھا کہ نہ تو غالباً کسی مسلم تنظیم نے اس بارے میں کوئی بھرپور احتجاج کیا اور نہ ہی کسی اسلامی ملک کے

سربراہ کو اتنی توفیق ہوئی کہ وہ حکومتی سطح پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسلامی شعار کو اس بے حرمتی سے بچاتا۔ اگر غور کیا جائے تو توفیق ہوتی بھی کیوں، آج طارق بن زیاد اور صلاح الدین ایوبی تو ناپید ہیں البتہ اس کے برعکس برادران میر جعفر و میر صادق کی بہتات ہے۔

اشبیلیہ میں ہم نے جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھ چکے اور اب قرطبہ کی طرف کوچ کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اگلے دن ہم علی الصبح ہی اشبیلیہ سے روانہ ہو گئے اور پروگرام یہ تھا کہ راستے میں رومی دور کے آغاز کے کھنڈرات بھی دیکھتے جائیں۔ یہ کھنڈرات اٹالیکا کے نام سے جانے جاتے ہیں اور اشبیلیہ سے کوئی دس کلو میٹر دور ہیں۔ اٹالیکا کا شہر رومیوں نے ۲۰۶ء قبل مسیح میں قائم کیا تھا۔ اندلس کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شہر اپنی تین خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ اولاً یہ کہ رومیوں کا اندلس کی سرزمین پر یہ پہلا شہر تھا۔ دوسرے اس شہر نے دو رومی بادشاہ یعنی تراجان اور حدریان بھی پیدا کیے۔ اور تیسرے یہ کہ روم کی وسیع و عریض سلطنت میں یہ ان کا تیسرا بڑا شہر تھا۔ بہ الفاظ دیگر صرف روم اور اسکندریہ ہی اس سے بڑے تھے۔ اٹالیکا کی باقیات بتا رہی تھیں کہ یہ واقعی بہت بڑا اور اپنے زمانے کے اعتبار سے ایک ترقی یافتہ شہر تھا۔ سیدھی اور منظم انداز میں تعمیر کی گئی گلیاں، مکانات، حمام، شاہی دربار، سٹیڈیم کے کھنڈرات اور موزیک وغیرہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شہر کسی طرح بھی ہمارے ہڑپہ اور موئن جودڑو سے پیچھے نہ تھا۔ کھنڈرات کے اس بہت ہی وسیع و عریض سلسلے کو دیکھ کر میں دل میں سوچ رہا تھا کہ ایسے بڑے بڑے بادشاہ جو پوری دنیا فتح کرنے اور ساری انسانیت کو اپنے تابع کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے آج ان کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہیں رہا۔

دنیا کا نگینہ، ہمارا قرطبہ

اٹالیکا کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد ہم نے اپنی سواری کو قرطبہ کی راہ پر گامزن کر دیا اور حسب سابق میں دائیں بائیں کے قدرتی و مصنوعی مناظر کے مطالعے و مشاہدے میں مشغول ہو گیا۔ آج اور اس سے قبل کے دوران سفر میں یہ بات خاص طور پر محسوس کر رہا تھا کہ خواہ پہاڑیوں کی ڈھلوانیں ہوں یا سطح مرتفع پوٹھوہار جیسی زمین، پورا جنوبی ہسپانیہ زیتون کے باغات سے بھرا پڑا تھا۔ اگرچہ تاریخی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل رومیوں نے زیتون کا پودا اندلس میں متعارف کرایا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اسے نقدآور فصل کے طور پر مروج نہ کر سکے۔ یہ سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے کہ انھوں نے مشرق کے اس پودے کو مغرب کی بالکل مختلف نوعیت کی آب و ہوا میں اس قدر وسیع پیمانے پر کاشت کیا کہ آج جنوبی ہسپانیہ کا سارا علاقہ زیتون کے باغات سے پُر ہے۔ بلاشبہ زیتون کے تیل اور اس سے متعلقہ دوسری مصنوعات کی برآمد میں آج کا ہسپانیہ دنیا بھر میں صف اوّل کا ملک بن گیا ہے۔

قرطبہ جسے انگریزی میں کارڈوا کہتے ہیں دراصل اسی نام سے منسوب صوبے کا صدر مقام بھی ہے۔ اشبیلیہ کی طرح یہ شہر بھی دریائے گوادالقویر کے کنارے اور اپنے صوبے کے بالکل وسط میں آباد ہے اور اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ۲۰۰ قبل مسیح میں رومی بادشاہ آگسٹس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور یہ شہر آئندہ تقریباً چھ صدیوں کے لیے رومی سپین کا دارالحکومت بھی رہا۔ تاہم چوتھی صدی عیسوی میں دارالسلطنت قرطبہ سے اشبیلیہ منتقل ہو گیا۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ قرطبہ شہر بھی ترقی کرتا رہا مگر اس شہر کا اصل اور شاندار دور ۷۵۶ء میں شروع ہوا جب امیر عبدالرحمٰن اول نے ایک بار پھر اسے اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنا دیا۔ عبدالرحمٰن اول نے نہ صرف یہاں کھجور اور پپیتے کے باغات لگوائے بلکہ اس نے یہاں عربی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی اور فن تعمیر بھی متعارف کرایا۔ بعد کے اموی حکمرانوں نے بھی اس شہر میں بے بہا ترقیاتی منصوبے شروع کیے اور اس کی ترقی و خوشحالی میں اضافے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ عبدالرحمٰن ثالث کے زمانے میں تو یہ شہر جنوبی یورپ کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔ اس دور میں اس کی ترقی وخوشحالی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں بائیس اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، چھبیس عظیم الشان کتب خانے، پچپن ہسپتال، تین سو سے زائد عوامی حمام اور اتنی ہی تعداد میں مساجد عوام الناس کی طبی، علمی اور روحانی ضروریات پورا کرنے میں دن رات مصروف رہتی تھیں۔ اس شہر کی اسی عظمت اور شان وشوکت سے متاثر ہو کر دسویں صدی عیسوی کے مشہور جرمن شاعر راسویھا وان گیندرشیئم نے اسے دنیا کا نگینہ کہا تھا۔

یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس نے بارھویں صدی عیسوی میں میمونائیڈ اور ابن الرشد جیسے فلسفی پیدا کیے۔ میمونائیڈ یہودی النسل تھا اور فلسفے کے علاوہ طب میں بھی اس کا علم کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ ابن الرشد عظیم مسلم فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی علوم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ بدقسمتی سے ان دونوں علماء کو اپنے دور کے چند مذہبی انتہا پسند عناصر کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ غالباً اسی بنا پر میمونائیڈ قرطبہ سے ہجرت کر کے مشرق وسطیٰ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس چلا گیا جہاں اسے دربار کا طبیب مقرر کر لیا گیا۔ اگرچہ بارھویں صدی عیسوی میں مسلم سلطنت کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے قرطبہ کی ترقی بھی کئی دہائیاں پیچھے چلی گئی تاہم اس شہر کا اصل زوال اس وقت شروع ہوا جب ۱۲۳۶ء میں عیسائی حکمرانوں نے

اسے فتح کرنے کے بعد یہاں کے اسلامی تشخص کو عیسائیت کے رنگ میں رنگ دیا۔ اس فتح کے بعد قرطبہ کے شمال میں واقع قشتالیہ کی عیسائی ریاست سے لا تعداد لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ ان نئے حالات میں مسلمانوں اور یہودیوں کے لیے اس شہر میں رہنا محال ہو گیا۔ چنانچہ ہزار ہا علماء، ماہرین اور صنعتکاروں کے نقل مکانی کر جانے کی وجہ سے یہ شہر پس ماندگی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ باقی رہی سہی کسر سولھویں صدی میں پھیلنے والے طاعون اور سترہویں صدی کی داخلی افراتفری نے پوری کر دی۔

میں تاریخ کے انھی تخیلات میں گم سم تھا کہ پتہ اس وقت چلا جب ہماری کار چپکے سے قرطبہ شہر میں داخل ہو گئی۔ شہر میں داخلے پر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسی دوران حسن اتفاق سے شہر کی ایک شاہراہ سے گزرتے ہوئے جامع قرطبہ اور مسلمانوں کی تعمیر کردہ شہر کی حفاظتی دیوار دیکھ کر میری بے صبری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ انھیں دیکھنے میں ایک پل کی تاخیر بھی مجھے انتظار کی لمبی لمبی گھڑیاں محسوس ہونے لگیں۔ اسی دوران مقررہ ہوٹل کی تلاش میں سڑکوں اور گلیوں کی بھول بھلیوں میں بہت دیر تک سرگرداں رہنے کی وجہ سے بہت تاخیر ہو چکی تھی اور اب رات کی آمد آمد تھی۔ ہوٹل میں سامان رکھتے ہی میں نے اہل قافلہ سے کہا کہ میری بات غور سے سن لیں کہ اس وقت تک نہ تو میں آپ لوگوں کو کھانا کھانے دوں گا اور نہ ہی یہ شہر فتح کرنے کی اجازت ہو گی جب تک میں جامع قرطبہ کی بیرونی اور طائرانہ زیارت نہ کر لوں۔ خوش قسمتی سے دونوں نے فوراً ہی لبیک کہہ دیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہ چھوٹا سا قافلہ پیادہ پا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

میں پرانے لاہور اور لندن کی قدیم گلیوں سے کئی بار پیدل گزرا ہوں۔ تاہم اس وقت ہم قرطبہ شہر کے اس پرانے مسلمان محلے کی گلیوں سے گزر رہے ہیں۔ ان ہلکی پھلکی بل کھاتی، آنکھ مچولی اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی سہانی گلیوں سے گزرنے کا بھی جواب

نہیں۔ بڑا ہی جذباتی منظر ہے۔ یہاں پر ایک لمحے کے لیے تو میں ماضی میں ہوتا ہوں جبکہ دوسرے لمحے حال میں اور تیسرے لمحے پھر صدیوں پیچھے کے دور میں پہنچ جاتا ہوں۔ میں نے دنیا کے بڑے بڑے تاریخی مقامات دیکھے ہیں مگر میرے دل کے جو احساسات یہاں ہیں وہ میں نے کرۂ ارض کے کسی اور مقام پر کبھی محسوس نہیں کیے۔ جذبات و احساسات کے اسی بھنور میں، میں اس محلے کے قدیم اور جدید ادوار کے تقابلی جائزے میں محو ہو جاتا ہوں۔ اسی جائزے میں مجھے اچانک یاد آتا ہے کہ اوہ میرے اللہ یہ تو کبھی میرا ہی محلّہ ہوا کرتا تھا جہاں میرا بچپن گزرا اور ان گلیوں میں تو میرا روز آنا جانا ہوا کرتا تھا۔ مایہ ناز فلسفی ابن رشد سے تو یہاں میری اکثر اوقات ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں یہی ملاقاتیں بعض اوقات لمبے لمبے علمی مباحث کی شکل اختیار کر لیتیں۔ میں نے تو ان سے بہت کچھ سیکھا اگرچہ مجھے ان کے کئی نظریات سے اختلاف بھی ہوتا تھا تاہم یہ امر میرے دل میں موجود ان کی علمی عظمت پر کبھی اثر انداز نہ ہوا۔ انھی علمی و ادبی مجالس سے فارغ ہو کر جب میں اپنے گھر جانے کے لیے اس محلے کی گلیوں سے گزرا کرتا تو یہاں کھیلتے ہوئے پھولوں جیسے کئی بچے مجھے سلام کرتے۔ راہ چلتے کئی بزرگوں سے سلام دعا ہوتی اور کئی مائیں بہنیں میرے اہل وعیال کی خیریت دریافت کرتیں۔ اسی محلے کی کئی مساجد کے میناروں سے بلند ہونے والی اذانیں میری روح کو گرماتیں اور کئی گھروں سے قرآن مجید کی تلاوت کی آواز بھی سنائی دیتی جو میرے ایمان کو ہر دم تازہ رکھتی۔

چلتے چلتے میں دل ہی دل میں سوچ رہا ہوں کہ یا اللہ اب یہ سب کچھ کیوں بدل چکا ہے۔ اب یہاں نہ تو کوئی میرا پڑوسی رہا ہے اور نہ ہی محلے دار۔ اب یہاں نہ وہ علمی مجالس ہیں اور نہ ہی میرے وہ بزرگ اور مائیں بہنیں۔ میں تو اس گلی میں ہر گھر کے دروازے کو دیکھ رہا ہوں کہ شاید کہیں سے اچانک میرا کوئی جاننے والا نمودار ہو اور

السلام علیکم کہہ کر بغل گیر ہو جائے۔ مگر یہ میری خام خیالی ہے۔ یہاں تو اب بالکل ہی نئی مخلوق آ کر آباد ہو چکی ہے۔ ان گلیوں میں تو اب دین کی بجائے لادینیت پنجے گاڑے کھڑی ہے۔ اب تو میں اپنے ہی گلی محلے میں اجنبی ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ علامہ اقبال نے بھی بالترتیب شکوہ اور جواب شکوہ کے سلسلے میں کیا خوب کہا ہے:

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

میں ماضی و حال کے تصوارت کے بھنور میں الجھا ہوا دھیرے دھیرے نہ جانے کتنی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک جگہ پر پہنچا کہ یکا یک دونوں ساتھیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ لیجیے ہم مسجد قرطبہ آن پہنچے ہیں۔ میں فوراً متوجہ ہوا اور جونہی میری پہلی نظر مسجد پر پڑی تو انتہائی حیرانی کے عالم میں میرے دل کی دھڑکن کچھ دیر کے لیے تو رک ہی گئی۔ بلاشبہ میرے لیے اس لمحے کے جذبات و احساسات کو قلم بند کرنا ناممکن ہے۔ انسانی ہاتھوں کی مہارت اور فن تعمیر کے لحاظ سے ہماری اسلامی تاریخ کی کئی کتابوں میں مسجد قرطبہ کا بیان ایک خواب نما افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم رات کے آغاز کی اس گھڑی میں جو حقیقت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں وہ کتابوں میں پڑھے ہوئے افسانوں کی بنیاد پر قائم تخیل و تصورات سے بھی بہت آگے ہے۔ رات کے اندھیرے کی چادر کے اندر ہی ہلکی ہلکی چاندنی اور برقی قمقموں کی مدھم روشنیوں کے آئینے میں مسجد کی بھوری دیواریں اور ناقابل بیان فن تعمیر کسی اور ہی دنیا کا منظر پیش کر رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ لاہور میں جب بادشاہی مسجد تعمیر کی گئی تو دریائے راوی اس کے

ساتھ سے بہتا تھا اگرچہ بعد میں اس نے اپنا راستہ تبدیل کرلیا۔ بلاشبہ بادشاہی مسجد کی اپنی شان ہے تاہم دریائے گواد القوویر کے کنارے تعمیر کردہ جنت نظر جامع قرطبہ جسے تکمیل تک پہنچتے پہنچتے پوری دو صدیاں لگ گئیں اور اس دوران ہزارہا مسلم ماہرین اور مزدوروں نے اپنے ہاتھوں کی مہارت اور دلی خلوص سے اسے ایسے چار چاند لگائے کہ جن کا احاطہ کرنا قلم کے بس سے باہر ہے۔ مگر افسوس کہ اب یہ نہ تو مسجد رہی ہے اور نہ ہی درسگاہ بلکہ ایک گرجا اور سیر گاہ ہے۔ جامعہ کے پہلو رواں یہ دریا جسے قرطبہ کا دریائے راوی کہنا بے جا نہ ہوگا اس چاندنی رات میں بڑا ہی مسحور کن منظر پیش کررہا تھا۔ جامعہ کے بالمقابل اس دریا پر رومی عہد کا تعمیر کردہ پل آج بھی موجود ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں اس پُل کو مزید بہتر بنایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صدیوں بعد آج پھر اس پُل کی ازسرنو مرمت ہو رہی ہے۔ بلاشبہ یہ پُل اور جامع قرطبہ گردش روز گار کے انقلابات اور طویل تاریخی داستانیں اپنے اپنے سینوں میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس سارے منظر کے تناظر میں وہاں کچھ دیر کے لیے چہل قدمی کرتے کرتے میرے دل کی کیفیت بڑی ہی عجیب ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتے ہوئے ایک ریستوران میں پناہ لی، جلدی جلدی دو لقمے زہر مار کیے اور وہاں سے سیدھے ہوٹل جا کر فوراً ہی بستر میں جا چھپے۔ درحقیقت اب اپنے ماضی کی یہ ہلکی سی جھلک دیکھ کر میرے دل و دماغ وقتی طور کچھ مزید سوچنے اور ہضم کرنے سے قاصر ہو گئے تھے۔

دراصل عمومی طور پر بے تابی و بے صبری کے مادے سے بھرپور مخلوق یعنی انسان بھی اللہ کی بڑی عجیب تخلیق ہے۔ اکثر اوقات اسے نہ اِدھر چین آتا ہے اور نہ اُدھر۔ پس یوں سمجھیے کہ کچھ یہی ماجرا میرے ساتھ بھی تھا۔ دل و دماغ کی اسی کیفیت میں بستر میں پڑے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میرے اندرونی احساسات نے اچانک ایسا پلٹا

کھایا کہ یہ دیکھنے کی تڑپ اب اور بھی شدت اختیار کر گئی کہ جامع قرطبہ اندر سے کتنی خوبصورت ہو گی اور مسلمانوں کی ملک بدری کے بعد ہسپانوی حکمرانوں نے اس کا کس کس طرح سے حلیہ بگاڑا ہو گا۔ یہ سب کچھ جاننے کے لیے مجھے اب اس رات کی طویل گھاٹی کو عبور کرنا لازمی تھا۔ بہرحال جیسے تیسے کر کے یہ مرحلہ مکمل ہوا اور صبح بیداری پر اللہ کا نام لینے کے بعد جلدی جلدی چائے کے ایک کپ کے ساتھ دو ٹوسٹ پیٹ میں زبردستی گھسیڑے۔ بے تابی کے عالم میں دوسرے دونوں ساتھیوں کو ساتھ لیے میں قرطبہ کی انھی سابقہ اور پرانے مسلمان محلے کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے دوبارہ پھر اپنی عظمت رفتہ اور انسانی ہاتھوں سے تعمیر کردہ اس انوکھے تاریخی شاہکار کے صدر دروازے پر جا پہنچا۔ بلاشبہ دل کی کیفیت بڑی عجیب تھی اور یہ دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں کبھی ہزاروں مسلمان دن میں پانچ مرتبہ اپنے فرض کی ادائیگی اور روحانی تسکین کی خاطر اپنے مالک کے حضور سربسجود ہونے کے لیے بلا روک ٹوک جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ مگر صد افسوس آج یہ عظیم جامع گرجے اور سیرگاہ کا روپ دھار چکی ہے اور یہاں داخلے کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔

دراصل جامع کے اندر کا حال بیان کرنے سے قبل میں یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ عہد وسطیٰ کے عالم اسلام میں کوئی بھی جامع مسجد محض پوجا پاٹ کا مرکز ہی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ عہد رسالت ﷺ میں مسجد نبوی کی طرح ہر مسجد ایک مکمل درسگاہ اور سماجی مرکز بھی ہوا کرتی تھی۔ انھی مساجد میں ایک کونے میں طب وطبیعیات دوسرے میں فلسفے اور علوم اسلامی، تیسرے میں زراعت و باغبانی اور علم کیمیا اور چوتھے میں معاشیات و معاشرتی علوم الجبرے اور جغرافیے وغیرہ کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ اسی تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جامعہ قرطبہ تو اس وقت کے عالم اسلام کی تقریباً تمام جامعات سے بہت آگے تھی۔ چنانچہ یہاں یہ کہنا مبالغہ نہ

ہو گا کہ اس وقت کے مسلمانوں کے صدیوں پر پھیلے ہوئے عظیم الشان دور میں یقیناً ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں طلباء جو دنیا کے دور دراز کے کونوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے کی خاطر یہاں آئے اور اعلیٰ تعلیم کی انمول دولت سے مالا مال ہو کر اپنے اپنے خطوں کو منور کرنے کی خاطر واپس لوٹ گئے۔ مگر دکھ اس بات کا ہے کہ اغیار کو مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے خود مسلمانوں کی اپنی پستی کی وجہ سے یہ نادر تاریخی عجوبہ نہ تو آج مسجد رہی ہے اور نہ ہی درسگاہ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک صنم کدہ اور کلیسا کا روپ دیا گیا ہے۔ آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ وہ کیسے؟ تو لیجیے پھر اب اندر کا حال ملاحظہ کیجیے۔

سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ مسلم تاریخ کے اس طالبعلم نے اندر داخلے سے قبل ہی اپنے آپ کو زبردستی دھوکا دیا کہ میں تو آج بھی اسی صدر دروازے سے اپنی جامع میں داخل ہو رہا ہوں جہاں میں کل بھی آیا کرتا تھا۔ حالانکہ اب اصل بات یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا مروجہ حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کل کا یہ جامع مسجد کا صدر دروازہ آج ایک صنم کدے کے دروازے کا روپ دھار چکا ہے۔ اب اس دروازے کے بالائی حصے پر جڑے ہوئے دو نمایاں بُت ہر آنے والے مسلمان کا منہ چڑا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے پر میں نے خون کے گھونٹ پی کر اندر قدم رکھا تو اپنے آپ کو اس سابقہ عظیم الشان جامعہ کے بہت ہی وسیع و عریض صحن میں موجود پایا۔ میں حیران و پریشان ہو کر سوچ رہا ہوں کہ یہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ اس جگہ کو تو مسلم حکمرانوں نے زیتون کے سدابہار روایتی درختوں سے مزین کیا ہوا تھا۔ یہاں تو وضو کے لیے ملحقہ دریا سے حاصل کردہ شفاف پانی سے ہر وقت بھرے رہنے والے حوض ہوا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس پانی کو ہر دم تازہ رکھنے کے لیے دن رات رواں دواں فوارے موجود ہوا کرتے تھے۔ رات کی چاندنی راتوں میں انھی

فواروں میں سے اچھلتے ہوئے پانی کے قطرے جب حوض میں گرتے تو یہ مسحور کن منظر اپنی دلفریبی میں کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ یا اللہ کدھر گئے وہ میرے زیتون کے پیارے پیارے درخت اور کہاں غائب ہو گئے میرے وضو کرنے کے حوض۔ اب میں یہاں نماز کیسے پڑھوں، یہ تو شاید غلطی سے میں کہیں اور آ گیا ہوں۔ یہاں تو زیتون کی بجائے سنگترے کے درخت نظر آ رہے ہیں اور میرے وضو کے حوض گھاس کے پلاٹوں اور راہ داریوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

گذشتہ رات کی مدھم روشنی کے برعکس آج میں دن کی روشنی میں صحن میں کھڑے ہو کر دردبھری نگاہ سے مسجد کے مینار کو غور سے دیکھ رہا ہوں اور میرا دل خون کے آنسو روئے جا رہا ہے۔ یا اللہ تو ہی بتا کہ اب میں یہ شکایت تجھ سے نہ کروں تو اور کس سے کروں۔ تو نے مجھے یہاں سے کیوں نکال باہر کیا۔ کیا میں تیرا نام نہیں لیتا تھا۔ تو جانتا ہے کہ یہ مینار میرے ہی بھائیوں نے بنایا تھا اور اس میں سے دن میں پانچ وقت اٹھنے والی اللہ اکبر کی صدا میری روح کو گرمایا کرتی تھی ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح کی پکار سن کر میں مسجد کی طرف لپکتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اسی مینار سے اٹھنے والی فجر کی اذان کی سریلی آواز کا سرور تو بیان سے باہر ہوتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ یہ کسی موذن کی نہیں بلکہ کسی فرشتے کی آواز ہے جو خانۂ خدا کی طرف بلا رہی ہے۔ مجھے تو یہ مینار اب بہت خوفناک اور اجڑا ہوا لگ رہا ہے۔

ہائے میری بدنصیبی کہ اس ملک سے میرے نکلنے کی دیر تھی کہ بعد کے عیسائی حکمرانوں نے اشبیلیہ کی مسجد کے مینار کی طرح جامع قرطبہ کے مینار کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے اس مینار کا بالائی حصہ از سر نو تعمیر کر کے بس یوں سمجھیے کہ مسلمان کو زبردستی عیسائی بنا لیا ہے۔ مینار کی چوٹی پر پیتل کے ہلال کی بجائے پتھر کا بُت جڑا ہوا ہے۔ اس سے نچلے حصے میں کلیسا کی ایک بہت بڑی دھاتی

گھنٹی نے موذن کو اٹھا کر سمندر کے دوسری طرف شمالی افریقہ میں پھینک دیا ہے۔ اے میرے اللہ میں یہ سب کچھ کیا اور کیوں دیکھ رہا ہوں۔

قارئین کرام! بنیادی طور پر تو یہ مینار اور جامع کی تمام عمارت عرب اور ہسپانوی یا بہ الفاظ دیگر مشرق اور مغرب کے فنون تعمیر کے امتزاج کا ایک بے حد حسین اور انوکھا مرکب ہے۔ تاہم بعد میں کی گئی زبردستی، ناجائز اور بھدی قسم کی تبدیلیاں دیکھ کر بہت گھن آتی ہے۔ اب صحن میں کچھ دیر ادھر ادھر چلنے کے بعد کئی اور بتوں نے مجھے گھورنا شروع کر دیا تو شرمندگی سے نگاہیں نیچی کر کے آہستہ آہستہ قدموں سے جامع کے اندر جانے کی جسارت کی۔ یہاں قابل ذکر مگر قابل افسوس امر یہ ہے کہ آج کل سیاحوں کے لیے ایک رومانوی اور افسانوی ماحول پیدا کرنے کے لیے عمارت کے اندر جان بوجھ کر روشنیاں بہت مدھم رکھی جاتی ہیں۔ اندر داخل ہونے پر تو یقین کیجیے کہ مجھ پر جیسے سکتہ ہی طاری ہو گیا ہو۔ اللہ اکبر! اے میرے مالک یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ سنگ مرمر کے یہ سینکڑوں ستون اور ان ستونوں کے اوپر بنی ہوئی دہری محرابیں دنیا کی کسی اور عمارت میں موجود نہیں، کیا یہ واقعی انسانی ہاتھوں کا کمال ہے یا پھر اسے کسی اور مخلوق نے تعمیر کیا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ ہزاروں سال قبل مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی طرح مسجد قرطبہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی ذاتی نگرانی میں جنات سے تعمیر کروائی ہے۔ بلاشبہ عمارتی حسن اور تعمیراتی کاریگری وصناعی کی وجہ سے یہ مسجد بھی اُس مسجد سے کوئی زیادہ پیچھے نہ ہوگی۔

درحقیقت عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں، خوشحالی وفراوانی اور مسلم حکمرانوں، ماہرین اور مزدوروں کی صدیوں کی توانائیاں اور وسائل جو اس جامع پر صرف ہوئے ان کی وجہ سے یہ مسجد اپنی خوبصورتی، پائیداری، انوکھے فن تعمیر اور وسعت کے لحاظ سے حجاز مقدس یعنی

حرمین شریفین کی مساجد سے بہت آگے تھی۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ بعد کے مسلمانوں کے اپنے اعمال اور زمانے کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے یہ بے مثال جامع ایک صنم کدے کا روپ دھار گئی۔ میں تاریخ کے اسی تخیلاتی سمندر کے گہرے بھنور میں کہیں ڈبکیاں کھاتا پھر رہا تھا کہ میرے دونوں ساتھی مجھے بازو سے جھنجھوڑ کر آج کی حقیقی دنیا میں کھینچ لائے۔

میں اس وقت عمارت کے اندر موجود ہوں اور جامعہ کے وسیع ہال کا اندرونی حال آپ کے لیے مفصل طور پر بیان کرنا چاہ رہا ہوں۔ تاہم میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ بڑے دروازے سے اس بے بہا وسیع وعریض ہال کے اندر داخل ہونے پر ہم تھوڑا سا ہی آگے بڑھے ہیں کہ ہمارے دائیں جانب کی دیوار کے اندر ایک کمرہ نما جگہ پر ایک اور صنم کدہ موجود ہے۔ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ بت خانے کے اندر ایک اور بت خانہ ہے۔ میں ہال کے اندر کی اس مدھم روشنی میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہوں اور میری نظریں سنگ مرمر کے ستونوں کی تراش خراش اور چھت کے اندر کی دہری محرابوں کی نفاست اور خوبصورتی کے مختلف زاویوں کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ سارا منظر دیکھ کر آپ یقین کیجیے کہ مجھے یہ بالکل ہی یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ عمارت واقعی انسانی ہاتھوں کا کمال ہے۔ اپنے اردگرد چلتے پھرتے بے شمار لوگوں کی موجودگی کے باوجود بھی میں آنکھیں مل مل کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا بلکہ یہ حقیقت ہے۔ بلاشبہ جو کچھ اب میں دیکھ رہا ہوں یہ منظر اس بارے میں کتابی کہانیوں اور قصوں سے بھی کہیں زیادہ اور حیران کن حد تک خوبصورت ہے۔ اسی پس منظر میں، میں اب یہ امر بھی بخوبی سمجھ گیا ہوں کہ جب کوئی مصنف یہ کہے کہ ''بیان سے باہر ہے'' یا پھر ''قلم سے قید کرنا ناممکن ہے'' تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

میں نے اپنے دل کے اندر اپنے ماضی و حال کی ہلچل کی جذباتی شدت کو مسلسل منہ زور ہوتا ہوا دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کہہ دیا کہ آپ لوگ اب مجھے یہاں اکیلا چھوڑ دیں اور دو گھنٹے کے بعد ہال کے جنوب مغربی کونے میں ملیں۔ وہ دونوں باشعور انسان فوراً سمجھ گئے کہ چونکہ اس بندے کی زندگی بھر کا خواب اس وقت حقیقت کا روپ دھار چکا ہے اور اسی بنا پر اب شدت جذبات کی بنا پر اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔ اسی دوران ماضی و حال کی چپقلش اور تصوارت میں رواں دواں میں حقیقی دنیا میں اس وقت آیا جب اپنے آپ کو جامع کی محراب کے سامنے موجود پایا۔ محراب کیا تھی بس سنہرے رنگ کی قرآنی آیات سے کندہ امام کے کھڑے ہونے کی یہ جگہ خوابوں کی دنیا کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔

کچھ خوش قسمتی ہی کہہ لیجیے کہ اس محراب کا بالائی حصہ تو اسی طرح محفوظ ہے مگر بد قسمتی سے نیچے والا حصہ یعنی امام صاحب کے کھڑے ہونے کا حصہ بے دردی سے مسمار کر کے دیوار کے برابر کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ عمل مسجد کو گرجا بنانے کے پورے پروگرام کا ایک حصہ سمجھ لیجیے۔ محراب کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سنہری دروازہ ہے جو بلا مبالغہ طلا کاری کا حسنِ کمال ہے۔ یہ دروازہ خلیفۂ وقت کے لیے مسجد میں داخلے کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ محراب کے بالمقابل کچھ فاصلے پر ستونوں کے درمیان میں ایک اونچا چبوترہ بنا ہوا ہے۔ یہ امام صاحب کے لیے جمعہ کے خطبہ کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ اس کی خوبصورتی اور مینا کاری بھی بیان سے باہر ہے مگر بد قسمتی سے یہاں بھی اس کے زیریں حصے پر چونا اور پلستر وغیرہ پھیر دیا گیا ہے۔ انوکھے اور جادوئی فن تعمیر کی بنا پر محراب اور چبوترے ایسے ہی سمجھ لیں گویا کہ سونے کی انگوٹھی میں ایک کی بجائے دو جواہر جڑے ہوئے ہیں۔ نہایت تعجب کی ایک اور بات میں آپ کو یہ بتاؤں کہ علم الطبیعیات کے داؤ پیچ کو کام میں لاتے ہوئے مسلم ماہرین تعمیرات نے ستونوں اور ان

کے اوپر بنائی گئی دہری محرابوں کی ہیئت ترکیبی اس انداز سے ترتیب دی تھی کہ اس جامع کی عمارت کی بے بہا وسعت کے باوجود جمعے کے خطبے کی آواز دور بیٹھے نمازیوں تک بھی بآسانی پہنچ جاتی تھی۔ بلاشبہ یہ طرز تعمیر انسانی مہارت کی معراج تھی جو بعد میں غالباً بہت حد تک ناپید ہو گئی۔

مسلمانوں کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ اس مقدس عمارت کے ساتھ ایک اور بہت بڑی زیادتی کی گئی جو خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اس چبوترے سے متصل اور اس عالیشان عمارت کے بالکل وسطی حصے میں ایک بڑی تبدیلی کر کے اسے کلیسا بنا دیا گیا ہے اور یہاں باقاعدہ طور پر عیسائیت کی عبادت اور تبلیغ ہوتی ہے۔ یہ جگہ بھی بتوں سے مزین ہے۔ مزید بدنصیبی یہ کہ اس جامع کے کسی بھی حصے میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہ ساری صورت حال دیکھ کر میں اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ اے میرے کریم پروردگار! آج تو نے مجھے اتنا بدنصیب کیوں بنا دیا ہے۔ دل میں دکھ بھرے جذبات کی لہریں اٹھنا شروع ہو گئیں تو میں نے ایک کونے میں ستون کے پیچھے چھپ کر رب کائنات کے حضور ہاتھ اٹھا کر چند آنسو بہا لیے۔ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہونے پر طبیعت ذرا سنبھلی تو بائیں جانب کے ایک مخصوص کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں اسلامی فن پاروں کی بجائے عیسائیت کے نوادرات نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

میں جامع کی وسیع عمارت میں اپنے ماضی کو ٹٹولتا ہوا مارا مارا پھر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک کونے میں چھت پر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند محرابوں سے نہایت بے دردی کے ساتھ پلستر اکھاڑ دیا گیا ہے۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ اتنے حصے کا پلستر ہی آخر کیوں اکھاڑا گیا۔ دراصل اس کی حقیقت یہ تھی کہ اندلس سے مسلمانوں کی بے دخلی کے بعد اس پوری جامع کو مکمل طور پر کلیسا کے رنگ میں رنگنے کی خاطر یہ نازیبا حرکت کی

گئی۔ اس سلسلے میں ایک مجوزہ پروگرام کے تحت پوری عمارت کا دیدہ زیب اندرونی پلستر چھید کر تمام اسلامی آثار ختم کرنا اور ازسرنو پلستر کاری کر کے اسے عیسائیت کی تصاویر اور بتوں سے مزین کرنا تھا۔ اللہ کی بھی کیا شان ہے کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ اسے بنانے وسنوارنے والے اور اسے بگاڑنے والے ہاتھوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ چند محرابوں کو چھیدنے اور دوبارہ پلستر کاری میں ناکامی کی وجہ سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ اس بنا پر اس پروگرام کو وہیں ترک کرنا پڑا۔ ظاہر ہے اب ایسی حالت میں پوری کی پوری جامع کو کلیسا کے سانچے میں ڈھالنے کے خواب کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ مگر ان جنونی حکمرانوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ اپنی ہوس کی کچھ نہ کچھ تکمیل کی خاطر جامع کے بالکل وسط میں ایک حصے کو کلیسا میں تبدیل کرنے پر اکتفا کر لیا۔ بلاشبہ یہ ایک بہت ہی اوچھی اور نازیبا حرکت تھی۔ میں نے وہاں پر موجود چند غیر ملکی سیاحوں کو جنھیں نہ تو اسلام کی الف بے کا پتہ تھا اور نہ ہی انھیں مسلمانوں سے کوئی ہمدردی تھی یہ کہتے سنا کہ یہ بہت بھونڈی حرکت ہے اور ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر بدقسمتی یہ کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ حسرت ویاس کے عالم میں مجھے ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال کا دورۂ جامع قرطبہ اور وہاں ان کے دو نفل پڑھنے کا تاریخی منظر آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگا۔ بس یوں سمجھیے کہ چشم تصور سے اس منظر کا دیکھنا تھا کہ میرے دل و دماغ بھی آب دیدہ ہو گئے اور ہاتھ خود بخود دعا کے لیے اٹھ گئے۔

میں نے جامع کے بے مثال ہال سے باہر نکل کر ایک طائرانہ نگاہ گردونواح پر ڈالی تو نظریں ایک بار پھر اس شاہکار مینار کی زیارت کرنے لگیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے اس کی تعمیر وساخت کا یہ انوکھا انداز آخر کیوں کر اختیار کیا۔ کیونکہ شکل و شباہت کے لحاظ سے یہ مینار اس وقت کی دنیا میں موجود دیگر مساجد کے میناروں سے بالکل مماثلت نہیں رکھتا۔ میں اسی عقدے کے حل کی تلاش

میں اسلامی تاریخ کے سمندر میں رواں دواں تھا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا والا معاملہ ہوا۔ دراصل یہ واقعہ اس طرح سے ہے کہ جامع قرطبہ کا یہ مینار اپنی ساخت میں دمشق کی قدیم جامع مسجد کے مینار سے کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ بالخصوص اس کے زیریں حصے کی مشابہت زیادہ ہے۔ دمشق کی جامع مسجد کی تعمیر اموی دور حکومت کے اواخر میں ہوئی۔ یہ زمانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے زیادہ بعد کا نہیں تھا۔ بہر حال یوں سمجھ لیجیے کہ اس اموی مسجد کا پلستر اور رنگ وروغن ابھی گیلا ہی تھا کہ ایک روح فرسا خون خرابے کے بعد دمشق میں خلافت اموی خاندان سے عباسی خاندان میں منتقل ہوگئی۔ تاہم اسی دوران اندلسی مسلمان حکمران جو کہ اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور جن کا خمیر دمشق سے اٹھا تھا ہسپانیہ کی سرزمین پر مستقلاً اسلامی جھنڈا گاڑ چکے تھے۔ خاص طور پر پہلے اندلسی خلیفہ عبدالرحمٰن اوّل کو تو جس کا عہد ۷۵۶ء سے لے کر ۷۸۸ء تک پھیلا ہوا ہے اپنے آبائی وطن یعنی ملک شام کی یاد بار بار تڑپاتی تھی۔ تاہم ستم ظریفی یہ تھی کہ دوسری طرف دمشق میں مخالف عباسی خاندان کی حکومت ہونے کی وجہ سے وہ وہاں ساری زندگی قدم رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے دل کی اس پیاس کو بجھانے کی خاطر اس نے مسلم ماہرین تعمیرات کو ہدایت کی کہ جامع قرطبہ کے مینار کی بنیادوں اور زیریں حصہ کی کچھ نہ کچھ مشابہت جامع دمشق سے ضرور ہونی چاہیے۔

میں اسلامی تاریخ کی انھی راہ داریوں میں معلوم نہیں کہاں کہاں رواں دواں تھا کہ مجھے اہل قافلہ نے جھنجھوڑا اور بھوک کا شکوہ کیا تاہم مجھے کھانے کی ابھی بالکل کوئی طلب نہیں تھی۔ خیر تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک ریستوران سے دو چار نوالے زہر مار کیے۔ یہاں سے فارغ ہونے پر ہم اندلسی مسلمانوں کی تعمیر کردہ شہر کی قلعہ نما حفاظتی دیوار کے دیدار کی خاطر روانہ ہو گئے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس دیوار کی عظمت کے

بارے میں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ یہ یونیسکو کے عالمی تاریخی ورثہ برائے تحفظ کی اولین فہرست میں شامل ہے۔

ہم لوگ دیوار کے مختلف حصوں کے مناظر دیکھنے کی خاطر ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ اس دور کے مشہور مسلم فلسفی اور ماہر معاشرتی علوم ابن رشد کے مجسمے پر جا پہنچے۔ ابن رشد جسے اہل مغرب ایووراس کے نام سے جانتے ہیں نے ارسطو اور افلاطون کے نظریات پر بھی گراں قدر کام کیا اور انھیں بہت دور تک آگے بڑھایا۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ اب جامع قرطبہ شہر کی قلعہ نما دیوار اور ابن رشد کا مجسمہ دیکھ لینے کے بعد مجھے علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ پر تحریر کی گئی نظم اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے بارے میں ان کے کچھ دیگر اشعار یاد آ گئے اور میری زبان پر فی البدیہہ جاری بھی ہو گئے۔ میرے منہ سے بہ آواز بلند یہ انوکھے الفاظ سن کر اہل کارواں کے کان کھڑے ہو گئے اور فوراً سیاق وسباق کا حوالہ دریافت کرنے لگے۔ جب میں نے ان سے یہ سارا پس منظر بیان کیا تو دونوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے دستی تھیلوں سے ڈائریاں نکالیں اور حکیم مشرق کے فرمان کو ضبط تحریر میں لانے لگے۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ لگائی اور انھیں فخر سے بتایا کہ امت مسلمہ نے مشرق میں صرف اقبال ہی کو جنم نہیں دیا بلکہ اس سے صدیوں قبل تمھارے مغرب میں ابوزکریا العوام اشبیلی جیسے ماہر نباتات کے علاوہ ابن الہیثم، القرطبی، الغافقی، ابن الطفیل، ابن رشد اور ابن عربی جیسے شہرۂ آفاق علماء بھی پیدا کیے۔ یہ سب عہد اسلام میں اندلس کی دھرتی کی پیداوار ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں اول الذکر کے علاوہ باقی تمام علماء کا تعلق قرطبہ شہر سے ہے۔

عہد حاضر کے مسلمانوں کے لیے عہد وسطیٰ والی جامع قرطبہ کی عزت اور آن بان تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کب اور کیسے پوری ہو سکے گی۔ تاہم یہ جان کر آپ کو یقیناً خوشی ہو

گی کہ مسلمان خواہ کتنا ہی کمزور اور گیا گزرا کیوں نہ ہو اس کے دل کی گہرائی میں ایمان کی چنگاری وقت آنے پر گردونواح کو منور کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی ایک زندہ مثال ۱۹۹۴ء میں قرطبہ کے پرانے مسلمان محلے میں قائم کی گئی ابن رشد اسلامی یونیورسٹی ہے۔ یہاں عربی، علوم اسلامیہ، قرآن اور حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یونیورسٹی سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جہاں روح کو گرمانے کے لیے دن میں پانچ وقت اذان کی سریلی آواز بھی سنی جا سکتی ہے۔ یہ یونیورسٹی اور مسجد ابھی اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں ہیں اور انھیں پھلنے پھولنے کے لیے بے بہا انسانی اور مالی وسائل درکار ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ آئندہ چند دہائیوں میں ان اداروں کی ترقی سے یہاں مسلمانوں کی تشنگی کو کم کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کے بیشتر حصے میں قرطبہ کا عظیم الشان شہر ہی دارالسلطنت رہا تھا۔ اسی بنا پر صرف شہر ہی نہیں بلکہ اس کے گردو نواح کا میلوں دور تک کا علاقہ بھی جنت کا منظر پیش کرتا تھا۔ تاریخ کے گہری نظر سے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالباً دولت کی ریل پیل کی وجہ سے مسلم حکمران اب بھی اس شہر کے جاہ و جلال سے پوری طرح مطمئن نہ تھے یا پھر ممکن ہے کہ وہ اس عہد کے اپنے مخالف حکمران یعنی بغداد میں قائم عباسی خلافت کے مرکز کو مات کرنا چاہتے ہوں گے۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے قرطبہ شہر سے کوئی آٹھ کلومیٹر دور "مدینة الزھرا" کے نام سے ۹۳۶ء میں ایک نئے شاہی قصبے کی بنیاد رکھی۔ آگرہ کے تاج محل کی طرح "مدینه الزھرا" کا نام اس نے اپنی چہیتی بیوی الزہرا کے نام پر رکھا تھا اور اس کی تعمیر ۹۶۱ء میں جا کر مکمل ہوئی۔ بس یوں سمجھ لیں کہ راولپنڈی کے پہلو میں اسلام آباد کے نام سے موسوم نیا دارالحکومت وجود میں آ گیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ تعمیر کے ان پچیس سالوں میں یہاں دس ہزار

ماہرین و مزدور اور ڈیڑھ ہزار خچر و اونٹ متواتر مصروف کار رہے۔ یہ قصبہ جو بنیادی طور پر شاہی محل تھا دو کلو میٹر طویل اور ایک کلو میٹر چوڑا تھا۔ اس کی تعمیر میں یورپ کی اعلیٰ درجے کی لکڑی اور شمالی افریقہ کا نایاب سنگ مرمر استعمال کیا گیا۔ شاہی محل سے ملحق ایک چڑیا گھر، مچھلیوں کے لیے چار تالاب، تین سو عوامی حمام، شاہی ملازمین کے لیے چار سو مکانات، شاہی حفاظتی دستے کے لیے دو بڑی بڑی بیرکیں، اسلحہ کی فیکٹری اور گودام، بازار، ورکشاپیں اور مساجد ایک خاص اور منظم انداز سے تعمیر کی گئی تھیں۔ بلاشبہ شاہی محل کی شان و شوکت ناقابل بیان تھی بالخصوص شاہی دربار، دارالوزراء اور شاہی مہمان خانے کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں سونے اور ہیرے جواہرات کی میناکاری اس انداز اور اس کثرت سے کی گئی تھی کہ جو بھی سفارتی وفد بادشاہ سے ملنے آتا وہ مہمان خانے کی خوبصورتی اور دولت کے انبار دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ اس سارے منصوبے کی تعمیر پر اٹھنے والی لاگت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچیس سال تک پوری سلطنت کے بجٹ کا ایک تہائی یہاں خرچ ہوتا رہا۔ اس سارے کام کی نگرانی عبدالرحمٰن ثالث کے بیٹے الحاکم نے کی۔ باپ کی وفات کے بعد بادشاہ بننے پر اس نے یہاں اور بھی توسیع کی۔ مدینہ الزہرا کی خوبصورتی کے بارے میں یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں کہ اپنے عہد [illegible] روئے زمین پر ثانی نہیں رکھتا تھا۔

تعجب انگیز امر یہ ہے کہ بے بہا قومی وسائل خرچ ہونے کے باوجود یہ محل اپنی زندگی کی چند دہائیاں بھی پوری نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت کے داخلی خلفشار کی وجہ سے بربر نژاد باغیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر زمین کے برابر کر دیا۔ بعد کے زمانے میں صدیوں تک مقامی لوگ اس کی اینٹیں، پتھر اور دوسرا مواد اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے مکانات کی تعمیر میں استعمال کرتے رہے۔ طویل عرصہ تک یہ عمل جاری رہنے کی وجہ سے اس کا نام و نشان تقریباً مٹ ہی گیا۔ تاہم ۱۹۴۴ء میں ہسپانوی محکمہ آثار قدیمہ

نے یہاں کھدائی کر کے محل کی باقیات کو ازسرنو دریافت کیا۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اگر "مدینۃ الزہرا" کے آغاز و انجام پر ایک بصیرت بھری تجزیاتی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کو مسلم حکمرانوں کا دولت کا یہ بے پناہ ضیاع اور ان کا شاہانہ عیش و عشرت سے بھرپور طرز زندگی بالکل پسند نہیں تھا۔ کاش کہ آج ہم اپنی کل کی غلطیوں سے سبق سیکھ سکیں۔

الحمراء کے محلات

قرطبہ میں ہمارا قیام دودن کا تھا۔ اگلی صبح یہاں سے غرناطہ (یا انگریزی میں گریناڈا) کی طرف روانگی پر شہر کی ایک شاہراہ سے گزرتے ہوئے دور ہی دور سے اچانک ایک بار پھر جامع قرطبہ نظر آ گئی۔ چنانچہ حسرت بھری ایک آخری نظر اس پر ڈالی اور دل سے فی البدیہہ نکلا کہ:

واہ رے جامع قرطبہ تو کیا تھی اور کیا تھی تیری شان
ہائے یہ ستم ظریفی، آج نہ رہی وہ تو نہ تیری وہ آن بان

قرطبہ سے نکلتے ہی ہماری کار نے غرناطہ کی طرف فراٹے بھرنے شروع کر دیے۔ یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام آباد کی طرح یہ شہر بھی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے اور ملحقہ پہاڑی کی چوٹی پر اس وقت کے مسلم حکمرانوں کے تعمیر کردہ الحمراء نامی محلات کے ایک وسیع سلسلے کی وجہ سے آج بھی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ الحمراء کی شہرہ آفاق مقبولیت اور سیاحوں کے لیے اس بارے میں کشش کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بعض مخصوص حصوں کو دیکھنے کے لیے تو ہفتوں کیا بلکہ بعض اوقات مہینوں قبل اندارج کروانا پڑتا ہے۔ ہمارے میر کارواں نے بھی مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے بہت پہلے سے ہی یہ انتظام کر رکھا تھا۔ لہٰذا ہم بڑی احتیاط کے ساتھ یہ سوچتے ہوئے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئے کہ اگر اس وقت یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر شاید زندگی بھر دوبارہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہو۔

الحمراء کے بڑے بڑے داخلی دروازوں پر سیاحوں کی بہت ہی طویل قطاریں دیکھ

کر یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ یہ واقعی کوئی بہت ہی زبردست قسم کی قابل دید چیز ہے یہاں قابل ستائش امر یہ ہے کہ دنیا جہاں کے کونے کونے سے کھنچے چلے آنے والے سیاحوں کی کئی طویل قطاروں کے باوجود بھی نظم وضبط مثالی تھا۔ اسی بنا پر ہمیں یہاں پر طویل انتظار کی زحمت اٹھانے کی نوبت نہ آئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع الحمراء درحقیقت مختلف حصوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شاہی محلات و باغات اور قلعے کے کئی اجزاء کے مجموعے کا نام ہے۔ بلاشبہ اپنے تاریخی پس منظر میں یہ اپنی جغرافیائی وسعت اور مخصوص دلفریبی کی وجہ سے طویل داستانوں کے ایک مجموعے کا نام بھی ہے۔

الحمراء کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے سے قبل میں یہاں یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ غرناطہ کا عظیم اور تاریخی شہر آج بھی مشرقی اندلس کا دارالحکومت ہے۔ سیرا نیوادہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع اس شہر کا اصل عروج عہد اسلام میں تیرھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان میں ہوا تھا۔ اس دوران یہ نصیری خاندان کے تحت اندلس میں مسلمانوں کی آخری ریاست کا دارالسلطنت بھی تھا۔ بلاشبہ ۱۴۹۲ء میں یہاں سے مسلمانوں کے نکالے جانے تک یہ پورے یورپ کا سب سے امیر ترین اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ اس دوران یہاں کئی عالیشان عمارتیں تعمیر کی گئیں اور علم وفن، سائنس وٹیکنالوجی اور صنعت وحرفت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اسی بنا پر بعض مؤرخین کی رائے میں تو یہ اس وقت یورپ کی بجائے پوری دنیا کا سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور خوش حال شہر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۲۷۳ء میں جب پورے اندلس کی مسلمان سلطنت سکڑ کر غرناطہ شہر اور اس کے تھوڑے سے قرب جوار کے علاقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی تو بھی نصیری حکمرانوں نے اپنی حکومت برقرار رکھنے کی خاطر اپنے دفاع کے لیے کبھی تو سمندر پار مراکشی سلطانوں سے مدد طلب کی اور کبھی ہسپانیہ کی کیتھولک ریاستوں

بالخصوص اراگان اور قشتالیہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ اس ضمن میں حیران کن بات یہ ہے کہ دفاعی نقطۂ نظر سے بیساکھیوں کے سہارے کھڑی اس ریاست کے مسلم حکمرانوں نے ہوش کے ناخن لینے اور تھوڑی سی بصیرت کا ثبوت دینے کے بجائے اپنی عیش و عشرت اور شاہانہ جاہ و جلال میں کبھی کمی نہ آنے دی بلکہ اس کے برعکس اس میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا رہا۔

مندرجہ بالا صورت حال سے انجام کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں۔ ۱۴۷۹ء میں اراگان اور قشتالیہ کی عیسائی ریاستوں کا ان کے متعلقہ حکمرانوں یعنی شاہ فرنینڈو اور ملکہ ازابلا کی شادی کی وجہ سے الحاق ہو گیا۔ اس واقعے کے دس سال کے اندر اندر انھوں نے غرناطہ کی مسلم ریاست سے رونڈا، ملاغہ اور المیریا چھین لیے۔ اب غرناطہ کا شہر چاروں طرف سے دشمنوں میں گھر کر تنہا رہ گیا تھا۔ تاہم ان حالات میں بھی شاہی خاندان کے اندر درباری سازشوں اور داخلی افراتفری کا سلسلہ قائم و دائم رہا۔ رہی سہی کسر بادشاہ کی دو چہیتی بیویوں کی اقتدار کی خاطر باہمی چپقلش نے پوری کر دی۔ درباریوں اور عوام الناس میں سے تقریباً آدھے لوگوں نے ایک بیوی کا ساتھ دیا جبکہ آدھے دوسری بیوی کے ہمنوا تھے جو کہ عیسائی تھی اور بالآخر وہی حاوی رہی۔ ۱۴۹۰ء میں اس داخلی افراتفری نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ اس صورت حال میں غرناطہ کے آخری تاجدار ابوعبداللہ نے مراکش، مصر اور ترک خلافت عثمانیہ سے برادرانہ طور پر مدد کی اپیل کی جو بالکل بے سود رہی۔ اس سے اگلے سال فرنینڈو اور ازابلا نے ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کے ساتھ غرناطہ پر چڑھائی کر دی اور کئی ماہ کے طویل محاصرے کے بعد دو جنوری ۱۴۹۲ء کو ابوعبداللہ نے ہتھیار ڈال کر جان کی امان طلب کی اور آخری پناہ کی خاطر مراکش کی راہ لی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس شکست فاش کے بعد مسلمانوں کو نہایت ذلت آمیز طریقے سے غرناطہ سے نکلنا پڑا۔ اس واقعے کا کچھ

تذکرہ ہم آئندہ کے صفحات میں کریں گے فی الحال یہاں الحمراء کا بیان ہماری اولین ترجیح ہے۔

الحمراء دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہونے کے علاوہ یونیسکو کی انسانی ورثہ کی فہرست میں اولین مقام رکھتا ہے۔ اس کے نام کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تعمیر کے وقت شاہی دربار کی دیواروں میں سرخ رنگ کا پتھر کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ جیسا کہ عربی زبان میں احمر سرخ رنگ کو کہتے ہیں اسی بنا پر اس کا نام الحمراء پڑ گیا۔ اس کے نام کی دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اندلس میں نصیری خاندان کی بادشاہت کا بانی محمد ابن یوسف ابن نصر دراصل ابن الاحمر کے نام سے مشہور تھا اور اسی نے ۱۲۳۸ء میں الحمراء کی تعمیر شروع کی۔ اس عہد میں الحمراء بعض اوقات قلعۃ الحمراء یعنی لال قلعے کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو یہ اپنے فن تعمیر کی خوبصورتی اور روئے زمین پر اپنی مثال آپ ہونے کی وجہ سے ایسا تاریخی شاہکار ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان میں ضرب المثل مشہور ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے بالکل متوازی ہسپانوی زبان میں یہ کہاوت ہے کہ جس نے الحمراء نہیں دیکھا اس نے درحقیقت کچھ نہیں دیکھا۔

الحمراء جس پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے وہ اپنی ساخت کی وجہ سے تین اطراف سے دشمن کی دسترس سے بالکل باہر تھا جبکہ صرف ایک طرف سے تنگ راستے کے ذریعے اس تک رسائی ممکن تھی۔ اس مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی بناء پر الحمراء کی دفاعی حیثیت مسلّمہ تھی۔ تاہم بدقسمتی سے اس کی یہ مسلّمہ حیثیت بھی ۱۴۹۲ء میں سسکتی ہوئی آخری اندلسی مسلم ریاست کو دم توڑنے سے نہ بچا سکی۔ الحمراء کی زیادہ تر تعمیر دراصل وہاں پہلے سے موجود رومی قلعے کے کھنڈرات کی بنیادوں سے اٹھائی گئی تھی۔ دشمن کے حملوں سے حفاظت کی خاطر اس کی قلعہ نما چار دیواری کی موٹائی بہت زیادہ تھی۔ تعجب انگیز امر یہ

ہے کہ اگر الحمراء کی چار دیواری کو مدنظر رکھا جائے تو اس پورے سلسلے کی شکل وصورت کافی حد تک ایک بحری جہاز سے ملتی جلتی ہے۔ بلکہ فضا سے دیکھنے میں تو ایسا لگتا ہے کہ کسی دیوقامت بحری جہاز کا ڈھانچہ پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا گیا ہے۔ الحمراء کی لمبائی تقریباً ایک کلومیٹر جبکہ چوڑائی چوتھائی کلومیٹر کے قریب ہے۔ میں نے اس محل پر اٹھنے والے اخراجات کے بارے میں جاننے کی خاطر اگرچہ تاریخ کی کئی کتب کی ورق گردانی کی مگر کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ درحقیقت وجہ یہ تھی اور آپ کو بھی یقیناً یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ جب ۱۲۳۸ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تو وہ کسی نہ کسی صورت میں پندرھویں صدی کے اواخر میں مسلم ریاست کے خاتمے تک جاری رہی۔ گویا کوئی ڈھائی سو سال تک دھیرے دھیرے یہ کام جاری رہا۔ یہی وجہ ہے اتنے طویل عرصے میں صرف ہونے والی محنت اور اس پر اٹھنے والے مالی اخراجات کا تخمینہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ اسی پس منظر میں یہ کہنا بالکل مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ ان مسلم بادشاہوں نے اس دنیا میں ہی آسمان کی جنت کی تصویر کشی کی کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اسی بنا پر دنیا کے ہر حصے سے ہر سال لاکھوں سیاح اس طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

الحمراء کی چار دیواری میں تئیس حفاظتی ٹاور اور چار بڑے گیٹ ہیں۔ اس پورے سلسلے میں سب سے پرانا حصہ الکازابہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی حصے میں واقع نصیری شاہی محل کا نمبر آتا ہے۔ جو کہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کا اپنا اپنا صحن ہے۔ اس حصے کو کاسارئیل کہتے ہیں۔ ان عمارتوں کے علاوہ یہاں شاہی عملے کی رہائش گاہیں، سرکاری دفاتر، حمام اور فوجی بیرکیں بھی ہیں۔ الحمراء کا تیسرا بڑا حصہ جنرالائف کہلاتا ہے۔ شمال کی جانب واقع یہ حصہ باغات پر مشتمل ہے۔ ٹکٹ آفس سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم نے سب سے پہلے الکازابہ کا حصہ دیکھنا تھا چنانچہ پیورٹا ڈل وینو نامی گیٹ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ یہ راستہ پلازہ ڈی لاس

الجبز پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے جو کہ الکازابہ کی مشرقی دیوار کے ساتھ والی جگہ کا نام ہے۔ یہاں دیوار کے ساتھ تین ٹاور ہیں۔ الکازابہ کے مغربی حصے میں ایک دیوقامت ٹاور ٹورے ڈِلا وِلا یعنی واچ ٹاور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ الحمراء کی سب سے بلند جگہ ہے۔ ۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کے ہتھیار ڈالنے پر یہاں لہرانے والے اسلامی پرچم کو اتار کر عیسائی فاتحین کا پرچم لگا دیا گیا۔ اس ٹاور کے اوپر چڑھ کر دیکھیں تو چاروں طرف میلوں دور تک کے علاقے کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ بالکل ایسے ہی سمجھ لیجیے کہ آپ اسلام آباد کے دامن کوہ سے پوری وادی کا نظارا کر رہے ہیں۔ اس ٹاور کی بلندی سے نیچے واقع غرناطہ شہر کا نظارہ بھی بڑا ہی دلفریب ہے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ٹاور الحمراء کی چونچ پر واقع ہے۔

قطع نظر اس سہانے منظر کے یہ محل کا وہ حصہ ہے جہاں دیوار میں جڑی ہوئی پتھر کی ایک تختی مسلمانوں کے آٹھ صدیوں پر پھیلے ہوئے عظیم الشان دور کے درد ناک انجام کی یاد دلاتی ہے۔ اس تختی پر درج ہے کہ آخری اندلسی تاجدار ابوعبداللہ نے دو جنوری ۱۴۹۲ء کو سہ پہر کے تین بجے شاہ فرنینڈو اور ملکہ ازابلا کے سامنے ہتھیار ڈالے اور غرناطہ سے نکل گیا۔ تختی کے بالائی حصہ پر تانبے سے بنی ہوئی کلیسا کی ایک بہت بڑی گھنٹی اور اس کے اوپر دھات کا بنا ہوا صلیب کا نشان مضبوطی سے گاڑ دیا گیا ہے۔ یہ سارا نظارہ دیکھ کر میرے دل کی جو اندرونی حالت ہوئی وہ میں یہاں بیان کر کے آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مختصراً اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ چند لمحوں کے لیے تو سانس رک گئی اور آنکھوں نے بھی اپنا لاوا اگل دیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر دونوں ساتھی کچھ گھبرا گئے اور پوچھنے لگے کہ آپ ٹھیک تو ہیں۔ اب ایسی حالت کے دوران اور وہ بھی اس مخصوص جگہ پر میں کیا جواب دیتا۔ تختی کی طرف اشارہ کر کے میں نے کہا کہ ”دیکھتے نہیں کہ آپ لوگوں نے مجھے میرے ہی گھر سے مار بھگانے کے بعد قبضہ کر لیا“۔

دونوں صاحب فہم وفراست رکھتے تھے کہنے لگے: ''او یار یہ تو تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ مکافاتِ عمل کو کون روک سکتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ کل کلاں کو آپ یہاں دوبارہ لوٹ آئیں اور اسی تختی پر آپ کی روانگی کے بجائے آمد کی تاریخ درج ہو''۔ ان فی البدیہہ اور غیر معمولی کلمات کے بعد ہم تینوں ہکا بکا رہ گئے اور تعجب سے ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

قارئین کرام! غرناطہ سے مسلمانوں کی ذلت آمیز رخصتی کا کچھ تذکرہ تو ہم آئندہ کے صفحات میں بھی کریں گے مگر فی الحال یہاں بہتر یہی ہوگا کہ ہم اپنی توجہ الحمراء کے دیدار پر ہی مرکوز رکھیں۔ ہاں تو میں آپ سے بیان کر رہا تھا کہ مذکورہ بالا منظر سے ہم تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تو اپنے آپ کو ٹورے ڈلاس ارماس یعنی اسلحہ کے گودام کے بالمقابل پایا۔ راہ داری کے ساتھ ساتھ چند قدم چلنے کے بعد ہم کاسارئیل میں داخل ہوگئے۔ الحمراء کے اس حصے کو پلاسیاس ناظاریز یعنی شاہی محلات والا حصہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں سب سے پہلے ہم میکسوار میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ کاسارئیل کا سب سے پہلا محل ہے۔ اس میں داخلے پر سب سے پہلے ہم اپنے آپ کو شاہی دربار کے بڑے ہال میں پاتے ہیں۔ اس کے ایک طرف نماز ادا کرنے کے لیے قبلہ رخ جگہ بنی ہوئی ہے اور اس سلسلے میں امامت اور خطبے کا بھی انتظام ہے۔ یہاں بنی ہوئی محراب تو خاص طور پر قابل دید ہے۔ دوسری کئی اندلسی عمارتوں کی طرح اس ہال میں بھی قرآنی آیت ﴿ولا غالب الا اللہ﴾ کی کندہ کاری نہایت خوبصورتی اور کثرت کے ساتھ کی گئی ہے۔ شاہی دربار کے اس وسیع ہال کا مشرقی دروازہ صحن میں کھلتا ہے اور یہاں سے ہوتے ہوئے آپ کوارٹو ڈوراڈو یعنی سنہری کمرے میں داخل ہو سکتے ہیں۔

میں ابھی صحن میں کھڑا سنہری کمرے میں داخلے کے لیے پر تول رہا ہوں اور دل دھک دھک کر رہا ہے کہ نہ جانے اندر کیا ہی منظر ہوگا۔ دروازے سے اندر قدم رکھتا

ہوں تو دل سے بے اختیار نکلتا ہے کہ اے میرے اللہ! کیا یہ دنیا ہے یا جنت کا نظارہ۔ ایسے لگتا ہے کہ سونے کی بنی اور محرابوں سے سجی ان پوری دیواروں پر یہ ان دیکھی کندہ کاری انسانی کاریگروں کے بس کی بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر چہ دنیا میں مشرق اور مغرب کی وسعت کو میں نے بہت دور دور تک دیکھا ہوا ہے مگر آج جو کچھ میرے سامنے ہے ایسا منظر نہ تو میں نے کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی تصور کیا تھا۔ محل کا وسطی حصہ سیرالو کہلاتا ہے اور یہ شاہ یوسف اول (۵۴۔۱۳۳۳ء) کے عہد میں تعمیر کیا گیا۔ یہاں اطراف کے کمروں کے دروازے ایک نہایت ہی دیدہ زیب مستطیل نما صحن میں کھلتے ہیں جیسے پیٹیو ڈیلا اریانس کہتے ہیں۔ اس کے بیچ میں بنے ہوئے تالاب اور اس کے اندر موجود فوارے سے اچھلتا ہوا موتیوں جیسا چمکدار پانی فوراً ہی ہر سیاح کی نظر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہاں سنگ مرمر کا استعمال نہایت کثرت سے کیا گیا ہے۔ اسی صحن کے پیچھے دو ہال ایسے ہیں جو بادشاہ وقت سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔

اس محل کا سب سے وسیع اور شاندار ہال سیلا ڈلاس امباجاڈورس یعنی دارالوزراء ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں اندلسی سلطان ہمسایہ ریاستوں اور دور دراز کے ممالک سے آنے والے سفارتی وفود سے ملا کرتے تھے۔ مربع نما یہ کمرہ اپنے جاہ وجلال اور خوبصورتی کا جواب نہیں رکھتا۔ بلاشبہ بیرونی دنیا کے سفراء پر اپنی دولت کی دھاک بٹھانے کے لیے اندلسی حکمرانوں نے دارالوزراء کی تزئین و آرائش میں کوئی دقیقہ فروگذاست نہ کیا تھا۔ مکمل طور پر مربع شکل کے اس ہال کی دیواریں بھی سنہری اور لاجواب خطاطی و میناکاری کی وجہ سے یہ تاثر دیتی ہیں کہ یہ سارا طلاکاری کا کارنامہ ہے۔ اس ہال کی گنبد نما چھت کا بھی جواب نہیں اور اس میں لکڑی کا کام اس مہارت سے کیا گیا ہے کو پوری دنیا میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ہو۔ ہال کی شمالی دیوار پر ایک

استقبالیہ نظم کندہ ہے جس کے ایک شعر کا ترجمہ کچھ یوں ہے: ''صبح ہو یا شام میری طرف سے آپ کو خوش آمدید۔ آپ کی آمد باعث برکت ہو اور یہ خوشی، خوشحالی اور ہماری دوستی کے فروغ کا موجب ہو۔''

اگرچہ اس ہال کا یہ سارا منظر جنت کی عکاسی کرتا ہے مگر یہاں تصویر کا تاریک رخ دیکھنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ وہی ہال ہے جہاں آخری تاجدار ابوعبداللہ نے عیسائی حکمرانوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کیے تھے۔ بعدازاں اسی سال اور اسی ہال میں شاہ فرنینڈو اور ملکہ ازابلا نے کرسٹوفر کولمبس سے ملاقات کی اور اسے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کی مہم پر بھیجا۔ یہاں آپ ایک پہلو پر غور کریں کہ سقوط غرناطہ کے بعد عیسائی حکمرانوں کے حوصلے اس قدر بڑھ چکے تھے کہ اب وہ دور دراز کی ہندوستان جیسی وسیع و عظیم سلطنت کو بھی زیر کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ بہرحال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح عہد حاضر میں 9/11 کے واقعے نے دنیا کے مروجہ حالات کا دھارا موڑ دیا ہے بالکل اسی طرح سقوط غرناطہ اور کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے واقعے نے ہسپانیہ کے قومی اور بین الاقوامی حالات پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہیں سے اس ملک نے اپنے نوآبادیاتی نظام کا آغاز کیا اور آئندہ کی صدیوں میں اس میں مسلسل توسیع ہوتی رہی۔

میں تاریخ کے انھیں تصورات و تخیلات میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا اور حیرانی کے عالم میں بچوں کی طرح کبھی ایک چیز کو گھورتا تو کبھی دوسری کو۔ اسی اثنا میں ایک صحن میں پہنچ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا کہ میرے قدم اور سانس دونوں رک گئے۔ جامعہ قرطبہ کی طرح یہاں بھی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو ٹٹول رہا ہوں کہ میں قرونِ وسطیٰ کے الحمراء میں کھڑا ہوں یا زمانۂ حال کا سیاح ہوں۔ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ اسی خواب اور حقیقت کی کشمکش میں، میں

بے اختیار اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ میں یہ سب کچھ کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو پیٹیوڈلاس لیعانز یعنی بارہ شیروں والا صحن ہے۔ سنگ مرمر سے بنے مستطیل نما اس صحن کو چاروں طرف سے شاہی حرم کے ناقابل بیان قسم کے خوبصورت کمروں نے گھیر رکھا ہے۔

اس صحن کے وسط میں اصل اور حیران کن چیز یہ ہے کہ کسی نایاب قسم کے سنگ مرمر کے بنے ہوئے بارہ شیروں نے دائرے کی صورت میں ایک نہایت ہی عجیب وغریب فوارے کے پاٹ کو اپنی پشتوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ اس کے چاروں اطراف سے شفاف پانی کی چار نالیاں فوارے پر مرتکز ہوتی ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اس صحن میں دراصل جنت کی تصویر کشی اور بالخصوص اس فوارے اور چار چمکتے ہوئے پانی کی نالیاں بنا کر حوض کوثر کی شبیہہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے ملک میں مینار پاکستان یا مزار قائد کی طرح شیروں والا یہ فوارہ اس عہد میں سلطنت غرناطہ کی عظمت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ انسانی ہاتھوں سے تخلیق شدہ اس انوکھے عجوبے کے بارے میں، میں اپنے بچپن ہی سے کئی کتابوں میں پڑھتا آیا ہوں اور آج اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پا کر حیران کھڑا ہوں۔

کہتے ہیں کہ اندلسی عہد میں ان شیروں پر سونے کا پترا چڑھا ہوتا تھا۔ دراصل یہاں صرف ان شیروں کی ساخت اور فوارے کی مخصوص بناوٹ ہی عجوبہ نہیں تھی بلکہ تعجب انگیز امر یہ بھی تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہونے کی وجہ سے نہ جانے پانی کس طریقۂ کار کے تحت یہاں لایا جاتا ہوگا تاکہ دن رات یہ فوارہ موتی بکھیرتا رہے۔ اس فوارے کا اپنا نظام کچھ یوں ہے کہ اس کے چلتے رہنے کی وجہ سے پاٹ بھرا رہتا ہے۔ اسی پاٹ کو پشت سے سہارا دینے والے ہر شیر کا منہ کھلا ہوا ہے۔ پاٹ کا پانی شیر کے منہ سے ہوتا ہوا اچھل اچھل کر باہر آتا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اب یہاں پر

موسیقی اور علم الطبیعیات کے مشترکہ داؤ پیچ بمعہ جغرافیے کی ہئیت ترکیبی کی آمیزش سے مسلم ماہرین تعمیرات نے فوارے اور شیروں کے منہ سے پانی کے گرنے کا انتظام اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ اس سے بڑی ہی مسحور کن اور مختلف انواع کی سریلی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں تو ایسے محسوس ہوتا گویا کہ فوارے سے موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ بلاشبہ یہ امر بھی جنت کے سریلے نغموں کی نقالی کی ایک کوشش تھی۔ یہ سارا منظر الفاظ کی قیود سے بالکل آزاد تھا اور میں کافی دیر تک وہاں کھڑا دنیا کے اس نہایت ہی انوکھے عجوبے کو بار بار دیکھتا رہا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دنیا کے بیشتر مؤرخین جنھوں نے اس فوارے کے موضوع پر قلم کشائی کی یہ گتھی سلجھانے سے قاصر نظر آتے ہیں کہ آخر ان شیروں کی تعداد بارہ ہی کیوں تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے تو محض اٹکل پچو لڑا کر اپنے قارئین پر علمی دبدبہ قائم کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مثال کے طور پر کئی مغربی مؤرخین نے یہود کے بارہ قبیلوں کے ساتھ ان کے قلابے ملا کر اپنی علمیت کی دھاک بٹھائی جبکہ بعض دوسروں نے ان کا تعلق سال کے بارہ مہینوں سے جوڑنے کی کوشش کی۔ کچھ دوسرے مصنفین نے محض ہوا میں تیر چلا کر برصغیر کی بارہ دریوں کے ساتھ زبردستی ان کا رشتہ ناتہ جوڑ دیا۔ بہر حال اصحاب کہف کی تعداد کی طرح یہاں بھی اس بحث کو طول دینا لاحاصل ہے۔

شیروں کے فوارے والا صحن اپنے چاروں طرف موجود جن کمروں سے گھرا ہوا ہے ان میں سے ایک سیلا ڈلاس ریز یعنی شاہی ہال کہلاتا ہے۔ یہ ہال جو کہ بادشاہ وقت کی خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا واقعی خوابوں کی دنیا کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس ہال کے تین حصے ہیں اور چھت بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔ چھت کے ان تینوں حصوں میں نہایت ہی کمال کی مصوری کی گئی ہے۔ ان تینوں میں سے درمیان

والے حصے میں مصوری کے فن پاروں کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ دس نامور شخصیات کسی خاص موضوع پر بڑے پر جوش انداز سے مشورے میں مصروف ہیں۔ یہ تصوراتی منظر غالباً محمد اول سے لے کر محمد پنجم تک کے ان دس نصیری بادشاہوں کی شبیہہ پیش کرتا ہے جنھوں نے محل کے اس حصے کی تعمیر کا کام کروایا۔ اطراف کے دونوں فن پاروں میں شکار اور دربار کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر تعجب یہ ہو رہا تھا کہ انھی بادشاہوں نے ایک طرف تو محل میں دیدہ زیب مسجد بنائی ہوئی ہے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس اپنی خوابگاہ کو مصوری سے سجایا ہوا ہے جس کی اسلام میں واضح ممانعت ہے۔

قارئین کرام! ان صفحات میں اب تک ہونے والے تذکرے میں آپ کا ساریئل یعنی الحمرا کے شاہی محل کے اس حصے کا بیشتر حال جان چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید کچھ کمرے، ہال اور تالاب ایسے بھی ہیں جو اس محل کی شان وشوکت کو دوبالا کرنے میں کم اہمیت نہیں رکھتے۔ تاہم طوالت سے بچنے کی خاطر ہم اس بیان کو یہیں سمیٹ کر چند لمحوں کے لیے الحمراء سلسلے کی چار دیواری کے اندر واقع ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کے محل میں چلتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مسلمانوں سے حکومت چھیننے کے بعد فاتح عیسائی حکمرانوں نے اپنا رنگ بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس کی زندہ مثال پلاسیو ڈی کارلاس پنجم نامی محل ہے۔ اس محل کی تعمیر شاہ چارلس پنجم نے ۱۵۲۶ء میں شروع کرائی۔ یہاں داخلے پر فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ یکا یک اپنی شاندار تہذیب چھوڑ کر اجنبی ثقافت میں داخل ہو چکے ہیں۔ مغربی طرز تعمیر کا مربع نما یہ محل دو منزلہ ہے جبکہ اس کے وسط میں بالکل دائرے کی شکل کا ایک وسیع صحن ہے جو اس ''مہذب بادشاہ'' نے بیلوں کی لڑائی کے لیے بنایا تھا۔ اس محل کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اپنے سنگ بنیاد رکھے جانے کے صدیوں بعد بھی یہ ادھورا ہی رہا۔ حتیٰ

کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہسپانوی حکومت نے سیاحت کے فروغ کی خاطر جیسے تیسے کر کے اسے تکمیل تک پہنچایا۔ یہاں افسوس ناک امر یہ ہے کہ شاہ چارلس پنجم نے اس کی تعمیر کے تمام اخراجات اس عہد میں بچے کھچے اندلسی مسلمانوں پر بھاری ٹیکس عائد کر کے پورے کیے۔ تاہم قدرت کا نظام بھی عجیب ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کی وجہ سے اسے یہاں ایک دن رہنا بھی نصیب نہ ہوا۔ آج اس محل کی عمارت میں دو عجائب گھر واقع ہیں اور یہاں مسلمانوں کے زوال اور عیسائی فاتحین کی ثقافت کی عظمت کی دل کھول کر عکاسی کی گئی ہے۔ حسن اتفاق سے جامع قرطبہ کے وسط میں واقع کلیسا کی مانند الحمراء کے درمیان میں موجود یہ محل بالکل نہیں سجتا اور اسی رائے کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کئی غیر ملکی سیاحوں کو بھی سنا ہے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اب ہم الحمراء کے تیسرے اور آخری حصے جنز الائف کو بھی ایک نظر دیکھتے ہیں۔ نہایت وسیع باغات پر مشتمل یہ حصہ الحمراء کی قلعہ نما چاردیواری کے باہر کی طرف پہاڑی کی ڈھلوان پر پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنز الائف کی اصطلاح دراصل عربی کے الفاظ "جنتہ العارفه" سے اخذ کی گئی ہے اور محل کے اس حصے میں بھی باغات کی صورت میں جنت کی عکاسی کی گئی ہے۔ باغات کا یہ نہایت ہی منظم اور طویل سلسلہ کئی طرح کے تالابوں' بیسیوں فواروں اور راہ داریوں کے علاوہ لاکھوں رنگ برنگے پودوں اور درختوں کے سہانے منظر کی بنا پر واقعی اس دنیا میں آسمان کی جنت کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ بلا شبہ ایسا تاریخی باغ شاید ہی دنیا کے کسی اور حصے میں واقع ہو۔ اس حقیقت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اگرچہ لاہور کا شالامار باغ اپنی خوبصورتی اور دلفریبی میں جواب نہیں رکھتا تاہم اس کا مقابلہ اگر الحمراء کے جنز الائف سے کیا جائے تو یقین جانیے کہ اول الذکر تو شاید مؤخر الذکر کے پاسنگ کو بھی نہ پہنچ سکے۔ باغ کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی چھوٹی چھوٹی نہریں اور شفاف پانی کی نالیاں

میرے لیے تعجب کا باعث اس لیے بھی تھیں کہ میں سوچ رہا تھا کہ اس عہد میں اتنی بڑی مقدار میں پہاڑ کی اس اونچی چوٹی پر پانی پہنچانے کا انتظام کیونکر کیا گیا ہوگا۔ بلاشبہ یہ سارا منظر نہایت ہی حیران کن قسم کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم تینوں ساتھی کافی دیر تک اس دنیاوی جنت کی جھلک سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

الحمراء کی خوابوں کی دنیا کے بعد اب تھوڑا سا تذکرہ غرناطہ شہر کا بھی ہو جائے۔ خوبصورت اور سرسبز وشاداب پہاڑیوں کے دامن میں واقع اس شہر میں آج بھی اندلسی عہد کے چند بچے کھچے آثار باقی ہیں۔ انھی میں سے ایک شہر کے البیکن نامی محلے میں عہد وسطی کے دور کی گلیاں ہر آنے جانے والے کو شاندار مسلم ماضی کی یاد دلاتی ہیں۔ تاہم اسی محلے کا چوک جو مسلمانوں کے ہتھیار ڈالنے کے واقعے کے فوراً بعد ہی عیسائی فاتحین کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا ایک بہت ہی دکھ بھرے واقعے کی گواہی بھی دیتا ہے۔ یہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ اسی شہر سے مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد نئے حکمرانوں نے مفتوحین کی تمام باقیات کا صفایا کرنا بھی اپنا اولین مذہبی فریضہ سمجھ لیا۔ چنانچہ اسی چوک میں اسلامی عہد کے غرناطہ کی عظیم درسگاہ کے کتب خانے کے اسی ہزار نادر قلمی نسخے بھی نذرِ آتش کر دیے گئے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ اس قبیح حرکت سے نئے قابضین نے مسلمانوں کے خلاف اپنے دل میں لگی ہوئی نفرت کی آگ تو شاید کسی حد تک بجھا لی ہو تاہم آنے والی صدیوں کے طلباء و محققین کے دلوں میں اپنے اس فعل کے متعلق نفرت ضرور پیدا کر لی۔

مسلم حکمرانوں نے غرناطہ میں ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ تاہم تاریخ کی کتابوں میں اس مسجد کے بارے میں کوئی خاص تفصیل موجود نہیں جس کی دو ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اولاً جیسا کہ عام مثل مشہور ہے کہ تاریخ ہمیشہ فاتح ہی لکھا کرتا ہے اور ثانیاً یہ کہ مسلمانوں کی روانگی کے بعد اس مسجد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی

گئی۔ پھر ہوا یہ کہ اسی کی بنیادوں پر ۱۵۲۶ء میں ایک بہت بڑا کلیسا کھڑا کیا گیا اور اس کی تعمیر میں وہی اینٹیں اور پتھر استعمال ہوئے۔ تقریباً پونے دو سو سال تک تعمیر و تزئین کے مختلف مراحل سے گزر کر ۱۷۰۴ء میں اس کلیسا کی تکمیل ہوئی۔ درحقیقت اس طویل تعمیراتی منصوبے کا اصل مقصد یہ تھا کہ عیسائیت کی فتح کے مذہبی رنگ کو نمایاں کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جائے۔

ملاغہ کو واپسی

غرناطہ اور اس سے قبل کئی دنوں تک اتنا کچھ دیکھنے کے بعد اب مزید کچھ دیکھنے کا نہ تو وقت باقی رہا تھا اور نہ ہی ہمت۔ چنانچہ اہل قافلہ نے اپنی خصوصی کانفرنس میں فیصلہ کیا کہ اب تک تاریخ کے جو مدوجزر دیکھے ہیں انھی کو ہضم کرنے پر اکتفا کیا جائے۔ حالات کے پیش نظر بات بھی غالبا معقول ہی تھی۔ اب ہمارے سفر کا آخری ایک دن باقی تھا کیونکہ اگلے دن شام کو ہم نے ملاغہ سے لندن کے لیے جہاز پکڑنا تھا۔ اب ہمارے لیے سفر کے اس آخری دن کو بطریق احسن استعمال کرنا بھی ایک بڑا چیلنج بن گیا جس سے پہلو تہی کرنے کی خاطر میں نے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ پائلٹ جانے یا نیویگیٹر مجھے جہاں مرضی لے چلو میرے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر میر کارواں نے کار کا رُخ ملاغہ کی طرف کر کے اسے پگڈنڈی پر ڈال دیا اور ساتھ ہی باگیں بھی کھلی چھوڑ دیں۔ غرناطہ سے کچھ سفر طے کرنے کے بعد اب سڑک ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اور پہاڑوں کے بیچوں بیچ سے راستہ بناتی ہوئی آگے ہی آگے جا رہی تھی۔ اسی دوران حسب سابق میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ماضی کے مزاروں کی سیر میں مصروف کار رہا۔ خاص طور پر میرے دل و دماغ ۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کے ہتھیار ڈالنے والے ذلت آمیز واقعے کے گرد بار بار گھوم رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ مگر عالمگیر صداقت ہے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ ابو عبداللہ اندلس میں مسلمانوں کی آخری اور بچی کھچی سلطنت کا آخری تاجدار تھا۔ بہ الفاظ دیگر آپ اسے اندلس کا بہادر

شاہ ظفر کہہ سکتے ہیں۔ اگر دونوں شخصیات کا مختصر اور سادہ سا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ان میں کئی پہلو مشترک نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اول یہ کہ دونوں ہی اپنے اپنے خطوں میں صدیوں پر محیط مسلم ادوار کے آخری تاجدار تھے۔ دوسرے دونوں کی حکومتیں ان کے اپنے اپنے قلعوں کی چار دیواری کے اندر تک ہی محدود تھیں۔ اور تیسرے یہ کہ دونوں کے دربار اور آخری سسکیاں لیتی ہوئی حکومتیں داخلی سازشوں اور افراتفری میں پھنسی ہوئی تھیں۔ چہارم یہ کہ دونوں نے اس آخری وقت میں بھی اپنے عوام کی بہتری وتحفظ کی خاطر کوئی خاص کوشش نہ کی۔ پنجم یہ کہ دونوں ہی طبعاً تساہل پسند واقع ہوئے تھے۔ ششم یہ کہ دونوں ہی بے وقت اور بے مقصد قسم کی شاعری کے دلدادہ تھے۔ ہفتم یہ کہ دونوں نے ہی اپنی کمزوریوں پر نظر ڈالنے کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو ترجیح دی۔ ہشتم یہ کہ دونوں ہی 'حرم' کے دلدادہ تھے۔ نہم یہ کہ دونوں کی پالیسی یہ تھی کہ جتنے دن اور جس طرح سے بھی ممکن ہو سکے اپنی اپنی علامتی بادشاہت کو برقرار رکھا جائے تاکہ ذاتی آرام وآسائش کا سلسلہ قائم رہے۔ دہم یہ کہ یہ کہ دونوں میں ہی بصیرت کا فقدان تھا۔ دراصل یہ وہ چند پہلو ہیں جن کی وجہ سے انھوں نے اس امر کو کوئی اہمیت نہ دی کہ تاریخ انھیں کن الفاظ سے یاد کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں نے شیر میسور ٹیپو سلطان بننے کے بجائے کم ہمتی اور بے حمیتی کی راہ اختیار کی اور اسلامی تاریخ کے مردانہ صفات کے حامل اور بہادر بادشاہوں کی فہرست میں اپنا نام نہ لکھوایا۔

میں آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر براجمان ابوعبداللہ کی بادشاہت کے آخری ایام کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک جیتی جاگتی فلم میری آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے اور میں خود بھی اسی کا ایک حصہ ہوں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ دو جنوری ۱۴۹۲ء اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا آخری دن تھا۔ غرناطہ میں نصیری خاندان کی یہ حکومت ۱۲۴۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ درحقیقت تیرھویں صدی سے

لے کر پندرہویں صدی کے اواخر تک کا تمام عرصہ کسی نہ کسی طرح سے اندلسی مسلمانوں کے لیے افراتفری کا دور تھا۔ اس دوران کئی چھوٹی چھوٹی خودمختار مسلم ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان کے بادشاہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہمیشہ آپس میں دست وگریبان رہے۔ یہی حکمران اپنی باہمی لڑائیوں کے سلسلے میں مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے بھاری تاوان کے عوض مدد طلب کیا کرتے تھے۔ انتہائی قابل افسوس امر یہ ہے کہ بات اسی تاوان کی ادائیگی پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ مسلم حکمران اپنی ہمسایہ عیسائی ریاستوں کو سالانہ خراج بھی ادا کیا کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ صدیوں کی جمع شدہ دولت سے مسلم حکمرانوں کے شاہی محل تو ہیرے جواہرات اور سونے چاندی سے بھرے ہوتے تھے۔ لیکن اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کی خاطر تاوان اور خراج وغیرہ کی ادائیگی کا سارا بوجھ وہ اپنے عوام پر ڈال دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ریاستیں دن بدن کمزور ہوتی گئیں اور یکے بعد دیگرے وہی نام نہاد امداد دینے والی عیسائی ریاستیں انھیں ایک ایک کر کے ہڑپ کرتی رہیں۔ بلاشبہ غرناطہ کی اندلسی ریاست بھی اس پورے منظر نامے کا ایک حصہ تھی۔

اگرچہ ڈھائی سو سال تک جیسے تیسے کر کے غرناطہ کی ریاست نے اپنی خودمختاری قائم رکھی لیکن اس کے کوتاہ اندیش اور فراست سے کورے حکمران یہ حقیقت بھول چکے تھے کہ بیگانی بیساکھیوں کے سہارے زیادہ دیر تک جینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے اواخر میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی بنیاد پر آخری سسکیاں لیتی ہوئی یہ ریاست دم توڑ گئی۔ قارئین کی دلچسپی کی خاطر یہاں اس ساری صورت حال کا خلاصہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مختصراً یہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ غرناطہ کی مسلم ریاست اپنا وجود برقرار رکھنے کی خاطر ہمسایہ قشتالیہ نامی کیتھولک ریاست کو سالانہ خراج ادا کیا کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خراج کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور نوبت یہاں

تک آن پہنچی کہ غرناطہ کے لیے اس بھاری رقم کی ادائیگی محال ہوگئی۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر ابوعبداللہ کے والد امیر علی ابوالحسن نے نہ صرف رقم کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیا بلکہ ۱۴۸۱ء میں قشتالیہ کے زہرہ نامی شہر پر چڑھائی بھی کر دی۔ درحقیقت فوجی نقطۂ نگاہ سے غیر مناسب منصوبہ بندی کی بنا پر یہ حملہ ایک فاش غلطی تھی۔ اس حملے کے جواب میں ڈیوک آف کادیز نے ۱۴۸۲ء میں غرناطہ کے آس پاس کے بہت سے علاقوں پر مختصر سے عرصے میں قبضہ کر لیا۔ انھی مفتوحہ علاقوں میں سے ایک الحّما کا قلعہ بھی تھا۔ الحّما کا قلعہ غرناطہ کے بہت قریب ہونے کے علاوہ ملاغہ شہر کے راستے پر واقع ہے۔ غرناطہ کے بعد اس آخری اندلسی ریاست کا یہ دوسرا بڑا شہر اور واحد بندرگاہ تھی۔ الحّما دراصل وہ قلعہ نما قصبہ تھا جس کی فتح کا خواب عیسائی حکمران بڑے عرصے سے دیکھ رہے تھے۔ اس سارے واقعے سے اندلسی ریاست کو دو ناقابل تلافی نقصان ہوئے۔ اولاً یہ کہ ریاست کا رقبہ سکڑ کر غرناطہ شہر تک محدود ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ چاروں طرف سے دشمن میں گھر جانے کے باعث بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔

یہاں یہ امر بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ امیر علی ابوالحسن کی فاش غلطیوں کے برعکس اس کے دشمنوں نے نہایت چالاکی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنی سابقہ روایت کے برعکس الحّما کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے بجائے جلد از جلد مزید فوجیں جمع کر کے یہاں اپنے قبضے کو مستحکم کیا۔ یوں اب وہ آخری معرکے یعنی غرناطہ کی فتح کی تمام تیاری مکمل کر چکے تھے۔ اس تاریخی مہم جوئی کی قیادت کے پیش نظر ملکہ ازابلا اور شاہ فرنینڈو نے یہاں پڑاؤ ڈال کر فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی دوران دوسری طرف الحمراء کے محل کی اندرونی حالت یہ تھی کہ دربار پوری طرح سازشوں میں گھرا ہوا تھا۔ انھی حالات میں پانچ مختلف نوعیت کے واقعات ایسے ہوئے کہ جنھوں نے اس دم توڑتی ہوئی ریاست کو آخر کار موت کی نیند سلا دیا۔

ان واقعات میں پہلا واقعہ یہ ہے کہ امیر علی ابوالحسن اس وقت بڑھاپے کی عمر سے گزر رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی ولی عہدی کے حصول کی خاطر باہم دست بہ گریبان تھے۔ امیر کے ان دو بیٹوں میں سے ایک کا نام ابوعبداللہ تھا جو اس کی مسلمان بیوی فاطمہ سے تھا۔ جبکہ دوسرا بیٹا اس کے حرم کی زریا نامی عیسائی عورت سے تھا۔ ابوعبداللہ کے چاہنے والوں کی تعداد نسبتاً کچھ زیادہ تھی تاہم اپنے باپ کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا جس کی وجہ سے اسے ہر وقت نظر بند رکھا جاتا تھا۔ زریا امیر کے دل ودماغ پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ اس نے امیر پر اپنا جادو چلانے کی خاطر کہا کہ اسے الہام ہوا ہے کہ اگر اس کا اپنا بیٹا ولی عہد مقرر نہ کیا گیا تو یہ بچی کھچی سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔ زریا کا گرویدہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ امیر بہت حد تک اس بات کا قائل ہو چکا تھا تاہم غرناطہ کے عوام کی اکثریت کی سوچ اس کے بالکل برعکس تھی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن جب امیر علی ابوالحسن سلطنت کے دفاع کی خاطر شہر سے باہر تھا تو عوام الناس نے ابوعبداللہ کو نظر بندی سے باہر نکال کر اپنا نیا امیر مقرر کر لیا۔ دوسرا واقعہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ابوعبداللہ نے امیر بنتے ہی ریاست کے جرنیل کی بیٹی سے شادی کر لی اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دی۔ اس کا یہ طرز عمل دیکھ کر عام لوگ اسے عیاش اور بزدل سمجھنے لگے۔ ابوعبداللہ نے اپنی دلیری اور جرنیلی ثابت کرنے کی خاطر آؤ دیکھا نہ تاؤ بلکہ آنکھیں بند کر کے نزدیکی عیسائی شہر 'لیوسینا' پر حملہ کر دیا جبکہ اس کا باپ امیر علی اور چچا محمد عرف الزغّال مجبوراً غرناطہ کے اندر کی عیسائی آبادی سے شہر کے دفاع کی کوشش کرتے رہے۔ اپنے باپ کی سابقہ ناکام فوجی مہم جوئی کی طرح ابوعبداللہ کی یہ فوج کشی بھی فاش غلطی تھی۔ اس مہم میں اسے نہ صرف بری طرح شکست ہوئی بلکہ وہ عیسائی حکمرانوں کے ہاتھوں قید بھی ہو گیا۔

تیسرا واقعہ یہ ہوا کہ ابوعبداللہ کے قید ہونے کی وجہ سے امیر علی ابوالحسن ایک بار پھر

بادشاہ بن گیا۔ تاہم بڑھاپے کی وجہ سے حکومت پر اس کی گرفت انتہائی کمزور تھی۔ اسی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اس کے چھوٹے بھائی محمد عرف الزغّال نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اب اس دور کا چوتھا واقعہ آپ کچھ یوں سمجھ لیجیے کہ ملکہ ازابلا اور شاہ فرنیندو نے غرناطہ کے اس داخلی عدم استحکام کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' والی پالیسی اختیار کی۔ انھوں نے ابوعبداللہ کو قتل کرنے یا قید میں رکھنے کے بجائے ایک نام نہاد امن معاہدے پر دستخط کروا کے آزاد کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے ابوعبداللہ کو امیر یا بادشاہ کہلوانے کا اختیار نہیں تھا۔ اور یہ کہ غرناطہ پر اصل اقتدار ملکہ ازابلا اور شاہ فرنیندو کا ہوگا۔ جبکہ ابوعبداللہ کی حیثیت صرف ایک داخلی منتظم کی ہو گی۔ اب جیسا کہ ظاہر ہے اس معاہدے کی وجہ سے اس کی حیثیت محض ایک علامتی حکمران سے بھی کم ہو کر رہ گئی تھی۔ تاہم وہ اسی پر مطمئن تھا۔ ابوعبداللہ نے غرناطہ واپسی پر اپنا راستہ صاف کرنے کی خاطر اپنے حکمران چچا محمد عرف الزغّال سے دھوکا کرتے ہوئے اسے عیسائی حکمرانوں کے ہاتھوں قید کرا دیا۔ اس ساری صورت حال کا مطلب یہ تھا کہ اس نے کیتھولک عیسائی حکمرانوں کو فاتح اور اپنے آپ کو مفتوح تسلیم کرتے ہوئے اپنے عوام کو ان کی غلامی میں دینا منظور کرلیا تھا۔

پانچواں اور آخری واقعہ ۱۴۹۰ء کے آخر میں اس وقت پیش آیا جب عیسائی حکمران غرناطہ شہر کی دیواروں تک آن پہنچے اور ابوعبداللہ سے کہا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے شہر ان کے اقتدار اعلیٰ میں دے دیں۔ غرناطہ کے عوام نے ایسے کسی معاہدے کو نہ مانتے ہوئے بغاوت کردی جس کے نتیجے میں عیسائی لشکر نے شہر کا محاصرہ کرلیا جو ایک سال تک جاری رہا۔ اس محاصرے کو انھوں نے مقدس مذہبی محاصرے کا نام دیتے ہوئے غرناطہ کے شہریوں کا دانہ پانی مکمل طور پر بند کر دیا۔ طویل عرصہ تک یہ صورت حال جاری رہنے کی وجہ سے جب لوگ بھوکے مرنے لگے تو امن مذاکرات کا

دور شروع ہوا۔ ان مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فاتح اپنی مفتوح آبادی کا قتل عام نہیں کرے گا اور انھیں پرامن طریقے سے شہر سے نکل جانے کی اجازت ہوگی۔ علاوہ ازیں اسی دوران ابوعبداللہ ہتھیار ڈالتے ہوئے شہر اور الحمراء کی کنجیاں فاتح حکمرانوں کے حوالے کر دے گا۔ یہ ساری کارروائی دو جنوری ۱۴۹۲ء کو ہونا قرار پائی۔ کہتے ہیں کہ جب ابوعبداللہ اپنے امراء و شرفاء کے ہمراہ محل کی کنجیاں شاہ فرنیندو اور ملکہ ازابلا کو دینے کی خاطر محل سے باہر آیا تو یہ بڑا ہی دردناک اور رقت آمیز منظر تھا۔ اس دوران اس کی ماں فاطمہ نے ایک نظر الحمراء پر ڈالی اور ابوعبداللہ سے کہنے لگی کہ 'دیکھو یہ وہ جگہ ہے جسے تم ترک کر رہے ہو تمھارے آباؤ اجداد یہاں بادشاہوں کی حیثیت سے فوت ہوئے۔ ابوعبداللہ یہ سارا منظر دیکھ کر رونے لگ گیا تو اس کی ماں نے اسے بڑا ہی تاریخی نوعیت کا جواب دیا اور کہنے لگی کہ: ''اگر تم مردوں کی طرح اپنی سلطنت کی حفاظت نہیں کر سکے تو آج عورتوں کی طرح روتے کیوں ہو'۔ بات بالکل سولہ آنے تھی۔

بلاشبہ کسی بھی بادشاہ کے لیے ہتھیار ڈالنا بڑا ہی ذلت آمیز عمل ہوتا ہے اور یہی صورت حال ابوعبداللہ کے ساتھ بھی تھی۔ محل سے نکلنے پر اسے خوراک اور سواری کے چند جانوروں کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ الحمراء کے اندر صدیوں کی جمع شدہ دولت فاتح عیسائیوں کے ہاتھ آئی۔ ابوعبداللہ فاتح کیتھولک شاہی جوڑے کو دیکھتے ہی اپنے گھوڑے سے نیچے اترا اور کہنے لگا: ''او میرے آقا! یہ آپ کے الحمراء کی کنجیاں ہیں جو میں نہایت عاجزی سے آپ کو پیش کرتا ہوں۔'' ابوعبداللہ یہ کہہ کر آگے جھکا تاکہ شاہ فرنیندو کا ہاتھ چوم سکے۔ تاہم فرنیندو نے حقارت سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ ابوعبداللہ یہاں سے نکل کر مراکش چلا گیا جہاں ۱۵۲۷ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ افسوس کہ اس مسلم تاجدار نے اپنے چچا کے ساتھ جس طرح میر جعفر جیسا سلوک کیا تھا تو قدرت نے بھی اس عمل بد کا اسے خوب سبق

سکھایا۔ کاش ایسا ہوتا کہ اگر ابوعبداللہ اندلس کا ٹیپو سلطان ہوتا تو آج تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ابوعبداللہ کے الحمراء سے نکلنے کے بعد ملکہ ازابلا اور شاہ فرنینڈو محل میں داخل ہوئے تو وہاں جمع شدہ ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کی کثرت دیکھ کر ان کے ہوش وحواس اڑ گئے۔ بلاشبہ انھیں یہ اندازہ تو تھا کہ محل کے اندر سابقہ مسلم حکمرانوں کی صدیوں کی جمع شدہ دولت بہت زیادہ ہوگی تاہم اب جتنی دولت ان کے ہاتھ آئی تھی یہ تو انھوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ کاش یہ مسلم حکمران اپنی دولت محل میں جمع کرنے کے بجائے اگر اسے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود اور فوج کی مضبوطی پر خرچ کرتے تو یقیناً انھیں یہ دن دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔

اب اگر بعد کے حالات کا مختصراً جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابوعبداللہ کے بھاگ جانے سے اندلس میں مسلمانوں کا بالکل صفایا ہوگیا۔ جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آمد اور پھر اس کے بعد ان کی پے در پے فتوحات سے بچنے کے لیے بہت سے عیسائی جنگجوؤں نے بھاگ کر شمالی ہسپانیہ کے پہاڑوں میں پناہ لے لی تھی۔ ان لوگوں نے عہد کیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مسلمانوں کو ہسپانیہ سے مار بھگائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے حصول کی خاطر کوششیں شروع کر دیں اور یہ سلسلہ آٹھ صدیوں تک جاری رہا۔ بالآخر دو جنوری ۱۴۹۲ء کو ان لوگوں نے اپنا گوہر مراد پالیا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر دیکھنے والی ہے کہ سیکڑوں سال کے شاندار دور کے اختتام اور نئے دور کے آغاز سے عوام الناس کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ طوالت سے بچتے ہوئے مختصراً اور سادہ الفاظ میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان دو ادوار کے ملاپ پر ہسپانیہ ایک بار پھر ''مسلمان'' سے ''عیسائی'' ہوکر اپنے آٹھ صدیوں والے پہلے مقام پر آ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں اندلسی عہد کی ساری خوشحالی وفراوانی ایک

قصۂ پارینہ بن گئی۔ بعد کے عہد میں مسلمان تو کیا عیسائی عوام پر بھی ظلم ستم اور مشکلات اور مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ان کے اثرات صدیوں تک محسوس کیے جاتے رہے۔ سقوط غرناطہ کے موقع پر بہت سے خوش قسمت مسلمان تو جان بچا کر شمالی افریقہ کے مختلف خطوں کو بھاگ چکے تھے مگر جو بد قسمت پیچھے رہ گئے انھیں تلوار کی نوک پر عیسائی بنا لیا گیا۔اس پر مزید ستم ظریفی یہ کہ اس کے باوجود بھی اس عیسائی ملک میں جن مسلمانوں اور یہودیوں نے عیسائیت اختیار کی انھیں اور ان کی آئندہ نسلوں کو حقیر سمجھا جاتا رہا۔ان لوگوں کا قصور یہ بتایا جاتا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد عیسائی نہیں تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بعد میں جب ہسپانیہ نے جنوبی امریکہ میں اپنا نوآبادیاتی نظام قائم کیا تو انھی لوگوں کی آئندہ نسلوں میں سے بہت سے لوگ وہاں جا کر آباد ہوئے۔ سننے میں آیا کہ آج اگرچہ وہ لوگ مکمل طور پر عیسائی ہیں لیکن ان کی رگوں میں اب بھی اپنے مسلمان آباؤ اجداد کا خون دوڑ رہا ہے اور اس عمل کی کوئی نہ کوئی جھلک بھی کبھی کبھار نظر آجاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج برازیل اور ارجنٹائن میں آباد ان میں سے کئی لوگوں کے نام نسل در نسل اسلامی چلے آرہے ہیں۔ تاہم افسوس اس بات کا ہے کہ انھیں اس بات کا احساس تک نہیں کہ ان کے اندر آج بھی مسلمانیت کی خشک شدہ بوند کا ایک آدھ قطرہ باقی ہے۔

غرناطہ سے ملاغہ کے سفر کے دوران میں آپ کا یہ سیّاح بیرونی دنیا سے بالکل لاتعلق ہو کر اپنی سیٹ پر براجماں تاریخی تخیلات کی فضاؤں میں محو پرواز تھا کہ ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی ساحل سمندر پر واقع ایک چھوٹے سے سیاحتی قصبے المونیکار میں داخل ہوگئی۔ یہ جگہ ہم تینوں کو اچھی لگی چنانچہ فوراً ہی بغیر کانفرنس کیے مشترکہ اعلامیہ جاری ہو گیا کہ اب عہد وسطیٰ کی اندلسی تاریخ اور جدید شہروں کی ہنگامہ خیز دنیا سے دور اسی پرسکون جگہ پر رات گزاری جائے۔ اب شام کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ موسم سرما کی شروعات اور سیاحتی

سیزن نہ ہونے کی وجہ سے یہ قصبہ بالکل ہی خالی خالی لگ رہا تھا۔ ہم ایک کم خرچ بالانشین ہوٹل میں سامان وغیرہ رکھ کر باہر گھومنے کے لیے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس قصبے کی پہاڑی کی چوٹی پر مسلمانوں کا تعمیر کردہ قلعہ ہے جو کہ اس وقت مملکت کے اس خطے کی بحری حدود کی حفاظت کی خاطر تعمیر کیا گیا تھا۔ اب یہ جاننے کے بعد تو اس کی زیارت ہمارے اوپر واجب ہو چکی تھی۔ اس فریضے سے فارغ ہو کر جب پہاڑی سے نیچے اترے تو رات کی آمد آمد تھی اور ساتھ ہی بھوک بھی پیٹ میں اپنے پنجے گاڑ چکی تھی۔

ہم تینوں کسی ریستوران کی تلاش پر کمر بستہ ہونے ہی والے تھے کہ اچانک نظر پڑی کہ قلعے کے قدموں میں واقع ایک ساحلی چٹان سے سمندری موجیں بار بار اپنا سر پھوڑ رہی ہیں۔ اس چٹان کی چوٹی پر ایک بہت بڑا مجسمہ ہے جو دور سے کسی مسلمان کا لگتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر دل کے اندر تجسس بھڑک اٹھنے کی وجہ سے بھوک کو عارضی طور پر خیر باد کہنا پڑا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ یہ مجسمہ پہلے اندلسی خلیفہ عبدالرحمٰن اول کا ہے۔ اس مجسمے کے نیچے ایک تختی لگی ہوئی ہے اور انگریزی زبان میں اس پر اس کی اپنے لشکر سے کی گئی تقریر سے لیا گیا ایک چھوٹا سا اقتباس درج ہے جو درحقیقت غور کرنے پر من گھڑت ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اصلی نہ ہونے کی تین بنیادی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کے ساتھ سیاق وسباق کا کوئی حوالہ موجود نہیں۔ دوسرے اس عہد میں آج کی طرح ہر فی البدیہہ تقریر یا بات کو قلم کی نوک سے قید کرنے کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔ تیسرے یہ کہ عبدالرحمٰن کا یہ فرضی قول خود بھی اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے۔ مثلاً اس تحریر کے مطابق یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں سے یہ کہے کہ: ''ہسپانیہ میں میں بھی ایک غیر ملکی ہوں اور تم بھی غیر ملکی ہو۔'' یہاں آپ سے یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کے ہمارے اس اندلسی دورے کے دوران مجھے شاید ہی کہیں نوادرات کی تختی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی ملی ہو بلکہ ہمیشہ ہر جگہ یہ تختیاں ہسپانوی زبان میں ہوتی تھیں۔ میرے لیے

اب یہ پہلا موقع تھا کہ یہ تختی انگریزی میں لکھی ہوئی دیکھتا ہوں اور وہ بھی ساحل سمندر پر واقع قلعے کے قدموں میں اور ایسے قصبے میں جہاں گرمیوں میں صرف غیر ملکی سیاح ہی آتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ آپ یوں سمجھیے کہ یہ منظر دیکھنے پر میں کچھ بے دل سا ہو کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔ اب کچھ کچھ رات کا اندھیرا چھا چکا ہے۔ اس مجسمے کی پشت تو قلعے کی طرف ہے مگر اس کے بالکل سامنے کی دوسری بلند چٹان کی چوٹی پر جب میری نظر پڑتی ہے تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہوں کہ بجلی سے روشن ایک دیو قامت صلیب رات کے ہلکے سے اندھیرے کی چادر کو چیرتی ہوئی خشکی اور سمندر میں دور دور تک اپنی موجوگی کا لوہا منوا رہی ہے۔ اب یہاں ان تمام اجزاء کی ہیئت ترکیبی کے فلسفے پر تھوڑا سا غور کرنے سے ہی میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ بھی ذرا ان نکات پر غور کریں کہ: اول یہ کہ قلعہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر ہے جسے مسلمانوں نے تعمیر کیا ہے۔ دوئم مجسمہ اس قلعے کے قدموں میں سمندر کے پانی کے بالکل قریب ہے۔ سوئم مجسمے کی پشت قلعے کی طرف ہے۔ چہارم مجسمے کے نیچے نصب شدہ تختی کی عبارت انگریزی زبان میں لکھی ہوئی جو یہاں کے حالات کے مطابق غیر معمولی بات ہے۔ پنجم اس ساحلی قصبے میں تقریباً تمام سیاح ہی غیر ملکی ہوتے ہیں۔ ششم صلیب مجسمے کے بالکل سامنے کی چٹان پر نصب کی گئی ہے گویا کہ خلیفہ کا منہ چڑا رہی ہے۔ اور ہفتم اس سارے پس منظر میں خلیفہ کی تقریر سے لیا گیا من گھڑت اقتباس جس میں وہ خود ہی کہتا ہے کہ ہم تو یہاں غیر ملکی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سرزمین ہماری نہیں بلکہ 'لوٹ مار کے بعد' ہم نے یہاں سے آخر چلے ہی جانا ہے۔

اس ساری صورت حال کو اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں تو حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس خالصتاً سیاحتی مقام پر بھی کس قدر فلسفیانہ انداز میں تہذیبوں کے تصادم کی عکس بندی کی گئی ہے۔ دراصل یہ سب کچھ اس دلیل کو سہارا دینے کے لیے کیا گیا ہے کہ باہر

کی دنیا کو بتا دیا جائے کہ اسلام اور مسلمانوں کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں، اسی بنا پر انھیں سمندر پار پھینک دیا گیا ہے اور یہ کہ ہسپانوی زمین عیسائیت کا گہوارہ ہے۔

اب اس سارے فلسفیانہ منظر نامے اور مصنوعی ڈرامے سے، میں اندر ہی اندر اس قدر کڑھنے لگا کہ میری باطنی حالت کے اثرات ظاہری صورت پر بھی طاری ہونے لگے۔ چنانچہ مجھے کچھ بے چین سا دیکھ کر دونوں ساتھی پوچھنے لگے کہ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے کیا؟ اب اس سے قبل کہ وہ میری باطنی حالت بھانپ کر کچھ کہتے میں نے اس سارے معاملے پر چادر ڈالنے کی خاطر مصنوعی طور پر مذاق کے انداز میں الٹا ان پر ہی چڑھائی کر دی اور کہا: 'میں نے تم لوگوں پر تکیہ کر کے سخت غلطی کی ہے۔ یہ تم دونوں ہی کی برکات ہیں کہ میں گھنٹوں ان چٹانوں پر پیدل چل چل کر ہلکان ہو چکا ہوں۔ مگر کیا کہنا تمھاری اعلیٰ ظرفی کا کہ اتنی توفیق بھی نہیں کہ اپنے ساتھی سے کھانے کا ہی پوچھ لیتے۔ مجھے تم لوگوں سے ہرگز ایسی توقع نہ تھی۔ کیا آخر اس نام نہاد 'پرسکون' جگہ پر رات گزارنے کا یہی مقصد تھا؟ میری یہ فی البدیہہ اور غیر متوقع تقریر سن کر دونوں نے یکا یک خوب قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی یہ قافلہ کسی انجانے طعام خانے کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

ہم تھوڑا سا ہی آگے گئے ہوں گے کہ ایک پاکستانی ریستوران کو اپنے سامنے پا کر حیران ہو گئے۔ اس قصبے اور اس موسم میں کسی پاکستانی مطعم (ہوٹل) کا مل جانا بھی عجیب حسن اتفاق تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ریستوران کے مالک اور ملازمین کا تعلق پنڈی بھٹیاں کے قریب ایک گاؤں سے ہے۔ دیار غیر میں اہل وطن کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر پھولے نہ سمائے اور خوب آؤ بھگت کی۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ: ''آپ لوگوں سے اتنے دن تک انگریزی میں ٹِٹ ٹِٹ کرتے کرتے میرا تو منہ ہی تھک گیا ہے۔ یہ زیادتی اب مزید برداشت نہیں ہو گی۔ اب آپ اچھی طرح سے سن لیں کہ میں یہاں اپنی دیسی بولی بولوں گا۔ آپ لوگوں نے

اگر میری بات چیت ضرور سمجھنی ہے تو کوئی دیسی لغت ڈھونڈ لیں مگر یہاں پر آپ کچھ دیر کے لیے مجھ سے کلام نہ کریں۔ باقی رہا کھانے کا معاملہ تو اس سلسلے میں میں دہی کی لسی، حلوہ پوری، چھولے اور پراٹھوں پر ہاتھ صاف کروں گا۔ آپ لوگوں نے جو بھی کھانا ہے کھا لیں مگر ہماری روایت کے مطابق داہنے ہاتھ سے کھانا ہوگا اور چھری کانٹوں کے استعمال اور دیگر ولایتی نخروں اور عشوہ طرازیوں پر مکمل پابندی ہوگی۔"

رات اس قصبے میں گزارنے کے بعد اگلی صبح ہم نے کار کو ایک بار پھر ملاغہ کی پگ ڈنڈی پر ڈال دیا اور دوپہر کے قریب وہاں پہنچنا ہوا۔ یہاں سے ہماری واپسی کی پرواز شام کے وقت تھی۔ لہٰذا اب ہم نے حسب پروگرام بیچ کے ان چند گھنٹوں کو عہد جدید کے ہسپانوی شہرہ عالم مصور آنجہانی پکاسو کی جائے پیدائش اور عجائب گھر دیکھنے پر صرف کرنا تھا۔ میری اندرونی صورت حال یہ تھی کہ گذشتہ آٹھ دنوں میں مسلمانوں کے آٹھ صدیوں پر پھیلے ہوئے کئی نشیب وفراز دیکھ لینے کے بعد اب درحقیقت کچھ مزید دیکھنے کی نہ تو خواہش باقی رہی تھی اور نہ ہی کچھ اور دیکھ کر اسے ہضم کرنے کی ہمت تھی۔ بہر حال ساتھیوں کی معیت میں مشترکہ پروگرام کی پابندی بھی ایک مجبوری تھی۔ ہم اپنی کار کو ایک جگہ کھڑا کرنے کے بعد پیدل ہی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ مطلوبہ عجائب گھر دیکھنے کے بعد اب پکاسو کی جائے پیدائش دیکھنے کی باری تھی۔ دراصل بیسویں صدی کا یہ مشہور مصور جس کی بعض تصاویر کروڑوں ڈالر میں نیلام ہو چکی ہیں ملاغہ میں پیدا ہوا اور یہیں پروان چڑھا تھا۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اس نے پانچ سال سے بھی کم عمر میں مصوری شروع کر دی اور اپنے ہاتھ کی صفائی سے آئندہ کئی دہائیوں تک دنیا بھر میں اس فن کے دلدادہ لوگوں کی تسکین کا سامان مہیا کرتا رہا۔

یہ مرحلہ بخیروخوبی طے ہونے کے بعد ہمارے لیے اگلا بڑا چیلنج کرائے پر حاصل کردہ کار کی واپسی تھی۔ وہ اس لیے کہ اب اتنے بڑے شہر اور اس کی پر پیچ گلیوں اور بڑی

بڑی مصروف شاہراہوں سے گزرتے ہوئے ہمارے لیے کار کے مرکز کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ ہم اسی منزل مقصود کی تلاش میں سرگرداں اس تاریخی شہر کے مختلف راستوں اور سڑکوں کی بھول بھلیوں میں کبھی گم ہو جاتے تو کبھی صراط مستقیم پر آ جاتے۔ انھی چکر بازیوں میں ہمیں اپنے ایک ساتھی جو کہ ہسپانوی زبان اور نقشہ خواندگی میں یدطولیٰ رکھتا تھا کا سارا فن اور مہارت بھی بے بس نظر آنے لگی۔

چنانچہ اس صورت حال میں ہم مختلف شاہراہوں اور چوراہوں سے کبھی آنکھ مچولی کرتے اور کبھی انھیں دغا دیتے ہوئے بالآخر کار کے مرکز تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں پہنچنے پر ابھی ہماری جان میں جان بھی نہ آنے پائی تھی کہ وہاں دفتر کے اہلکار کو پہلے سے ہی اپنا منتظر پایا۔ اس نوجوان نے ہمیں دیکھتے ہی معمولی سی پیشہ وارانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور ساتھ ہی کار کی کنجی ہمارے ہاتھ سے نوچتے ہوئے ہسپانوی زبان میں ٹکا ٹک انداز میں کئی الفاظ کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے گھبرا کر اپنے ساتھی سے پوچھا کہ کیا اس نے ہم سے کوئی بدکلامی تو نہیں کی۔ میرے دوست نے ہنس کر جواب دیا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں بلکہ اس نے رٹے رٹائے جملے میں ہماری خیریت دریافت کی ہے اور ہمارا جواب سننے سے قبل ہی شکریہ بھی ادا کر دیا۔ ہم تینوں ابھی اس ''باکمال لوگ اور لاجواب سروس'' کی تندی و تیزی سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ایک دوسرے اہلکار نے ہمیں اور ہمارے سامان کو یک مشت اپنی ویگن میں ٹھونسا اور سیدھا ہوائی اڈے پر اتار کر ہم سے گلوخلاصی حاصل کی۔ دراصل یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہو گیا کہ ہم تینوں تعجب سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واپسی پر لاجواب تیزی اور باکمال چستی یہاں کا معمول ہے۔ بہرحال بات جو بھی تھی یہاں کا یہ معمول اتنا برا نہیں تھا اگرچہ یہ ہمیں حیران اور متعجب ضرور کر گیا۔

ملاغہ سے لندن تک

ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ملاغہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچنے کے بعد ہمیں انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی اور جلد ہی چیک ان کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ہم نے بورڈنگ کارڈ لیا اور امیگریشن والوں کو اپنا دیدار کراتے ہوئے سیدھے جہاز میں قدم رنجہ فرمایا۔ چند ہی لمحوں کے بعد سرکنے اور رینگنے کے مراحل طے کر کے ہمارا طیارہ رن وے پر دوڑنے لگا اور جونہی رن وے سے الوداع ہو کر فضا سے بغلگیر ہوا اسی لمحے میرے ذہن نے بھی ایک بار پھر زمانۂ حال کو خیر باد کہہ کر ماضی سے تعلقات استوار کر لیے۔ اسی اثنا میں میں آنکھیں بند کر کے مسلمانوں کے صدیوں پر محیط اس عظیم الشان دور کے شاندار آغاز اور دردناک اختتام کا ایک طائرانہ جائزہ لینے لگا۔ تاریخ کے سمندر میں اترتے ہی میں سوچنے لگا کہ آخر مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے شروع ہی میں جب راڈرک ابھی نیا نیا بادشاہ بنا تھا کیوں حملہ کر دیا۔ اس ''بے چارے'' کو اپنی بادشاہت اور شراب و کباب کے چند دن تو مزے لوٹ لینے دیے ہوتے۔ بلاشبہ ہمارے اسلامی عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر کام کا ایک وقت معین کر رکھا ہے اور اس امر کی تکمیل کے لیے حالات و واقعات خود بخود اسی سمت پیش قدمی کرتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نادانستہ طور پر اسی حقیقت کی تصدیق بعض مغربی مؤرخین بھی کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں موضوع کی مناسبت سے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے علاوہ روئے زمین پر بے مثال بادشاہت بھی عطا فرمائی تھی۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس

ایک مخصوص قسم کی میز تھی۔ بلاشبہ یہ میز بھی ان کی عظیم الشان نوعیت کی حکمرانی سے عین مطابقت رکھتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ یہ فضا میں ان کے تخت کے ساتھ ساتھ محو پرواز رہتی۔ بعض روایات کے مطابق آپؑ کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک یہ میز یروشلم میں محفوظ رہی تاہم اس کے بعد یہ رومی حکمرانوں کے ہتھے چڑھ گئی اور کئی صدیوں تک ان کے پاس رہی۔ بعد کی صدیوں میں گردش زمانہ کی وجہ سے یہ میز ہسپانیہ کے عیسائی حکمرانوں کے پاس پہنچ گئی اور انھوں نے مذہبی عقیدت اور برکت کے حصول کے پیش نظر اسے اپنے دارالحکومت طولیدو کے ایک قلعہ نما کمرے میں مقفل کرلیا۔ اس کمرے کو بصیرت خانہ کہا جاتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں ایک نئی روایت نے جنم لیا کہ جو بھی نیا بادشاہ بنتا وہ سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ اس کمرے پر اپنی طرف سے ایک اور تالا لگوا دیتا۔ دراصل اس عہد کے مذہبی عقیدے کے مطابق یہ امر ہر نئے آنے والے بادشاہ کی بادشاہت کو طوالت بخشنے کے لیے ضروری ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ روایت صدیوں تک قائم ودائم رہی۔ لگتا ہے کہ بے چارہ بدقسمت دروازہ بھی نہ جانے کئی سو سال تک بیسیوں بھاری بھرکم تالوں کا بوجھ متواتر اپنے کندھوں پر اٹھائے عاجز آ چکا ہو گا۔ چنانچہ اسی بے بسی کے عالم میں اس نے اپنی بپتا نئے بادشاہ راڈرک کو سنائی ہوگی۔ اب یہ اللہ جانتا ہے کہ یہ صورت حال دیکھ کے راڈرک کے دل میں رحم کی لہر نے جوش مارا یا نئی نویلی بادشاہت کے خمار نے اس کی آنکھوں پر غرور وتکبر کا خول چڑھا دیا کہ اس نے فوراً حکم دیا کہ یہ تمام تالے توڑ کر دروازے کو فوراً کھول دیا جائے۔ بادشاہ کا یہ فرمان سن کر تمام درباری اور مذہبی پیشواء حیران وپریشان ہوگئے اور ہر ایک نے اپنے حکمران کو سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ راڈرک نے سختی سے حکم دیا کہ میں کسی قسم کی توہم پرستی کا قائل نہیں لہٰذا فوراً تالے توڑ کر دروازہ کھولا جائے اور میں خود دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر اتنے طویل عرصے سے کیا کچھ بند ہے۔

بادشاہ کا حکم آخر قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ صدیوں سے بند دروازہ کھولا گیا اور راڈرک اندر داخل ہو گیا۔ داخلے پر وہ کیا دیکھتا ہے کہ کمرے کے وسط میں سونے اور چاندی سے بنا ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ میز پڑا ہے۔ اس میز پر ہیرے جواہرات کی ایسی مینا کاری کی گئی ہے جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ مزید یہ کہ اس میز کے اوپر ایک ڈبہ پڑا ہوا ہے جس کے اطراف میں گھڑ سواروں کے چند چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ گھڑ سوار تیر کمانوں' تلواروں' نیزوں اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ ان کے سروں پر پگڑیاں' بال لمبے اور لباس ڈھیلے ڈھالے ہیں۔ بلاشبہ یہ دوسرے براعظم کی مخلوق ہیں۔ راڈرک حیرانی کے عالم میں اس ڈبے کو کھولتا ہے تو اس میں سے ایک پرچی برآمد ہوتی ہے اور اس پر درج ہے کہ:' جب بھی اس بصیرت خانے اور اس ڈبے کو کھولا جائے گا جو کہ صدیوں سے نہایت حکمت کے ساتھ بند رکھا گیا ہے تو اس وقت جزیرہ نما ہسپانیہ پر اس شکل وصورت کی قوم داخل ہو کر قابض ہو جائے گی اور یہ اس عہد کی ہسپانوی بادشاہت کا اختتام ہو گا'۔ تاریخ کی بعض کتب میں درج ہے یہ سطور پڑھ کر راڈرک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور یہی حال اس کے درباریوں کا تھا۔ تاہم مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اس واقعے کو زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ طارق بن زیاد نے لشکر کشی کر دی۔ جب راڈرک نے طارق کی فوج کو دیکھا تو فوراً پہچان گیا کہ یہ تو ویسے ہی لوگ ہیں جن کے مجسمے وہ ''بصیرت خانے'' کے تالے توڑ کر دیکھ چکا تھا۔ پھر حد یہ ہوئی کہ راڈرک اسی طارق کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔

ہسپانیہ فتح کر لینے کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اندلس کا حکمران مقرر کیا اور خود خلیفہ سے ملنے کے لیے دمشق کی راہ لی۔ بدقسمتی سے اپنے باپ کے برعکس عبدالعزیز کچھ تو رنگین مزاج واقع ہوا تھا اور کچھ کمزور شخصیت کا مالک بھی تھا۔

مسند حکمرانی پر بیٹھتے ہی اس نے آنجہانی راڈرک کی بیوہ سے شادی رچالی جو دراصل بہت مضبوط شخصیت کی عورت ہونے کے علاوہ دوسروں پر اثر انداز ہونے کے فن سے بھی خوب آگاہ تھی۔ اس نے عبدالعزیز کی بیوی بنتے ہی نوازئیدہ مسلم سلطنت کی ملکہ کا روپ دھارلیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خاوند کو بھی تمام شاہی و درباری آداب و روایات اختیار کروادیں۔ اندلسی مسلمانوں کے لیے یہ امران کی مذہبی عقیدے سے واضح طور پر متصادم تھا۔ چنانچہ فوراً ہی بغاوت نے جنم لیا اور مسلم سپاہوں نے عبدالعزیز کا صفایا کردیا۔

اسی دوران موسیٰ بن نصیر مسلم خلیفہ کو اندلس کی فتح کی خوش خبری اور مال غنیمت دینے کی خاطر دارالحکومت دمشق کی طرف رواں دواں تھا۔ اس سفر میں کئی سرکاری افسران کے علاوہ اس کے ہمراہ طارق بن زیاد اور بیسیوں ہسپانوی شہزادے اور شہزادیاں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں بے بہا مال ودولت اور غلاموں ولونڈیوں کی طویل قطاریں بھی محوسفر تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مذکورہ بالا سلیمانی میز بھی اس قافلے کے ساتھ تھا تاکہ اسے خلیفہ کی خدمت میں ایک انوکھے تحفے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ فروری ۷۱۵ء میں جب موسیٰ بن نصیر دمشق میں داخل ہوا تو اس کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ تاہم بدقسمتی سے حالات نے فوراً ہی کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ موسیٰ بن نصیر کی ساری عزت وعظمت خاک میں مل گئی۔

اس ضمن میں بعض تاریخی کتب میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ قبل ازیں جب طارق بن زیاد نے ہسپانیہ کا بیشتر حصہ آناً فاناً فتح کرلیا تھا تو موسیٰ بن نصیر اس کی برق رفتار پیش قدمی کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اسی بنا پر وہ فوراً شمالی افریقہ سے اندلس پہنچا اور طارق بن زیاد کو برا بھلا کہہ کر اس کے منہ پر کوڑے مارے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے طارق سے یہ بھی باز پرس کی کہ اس نے جلد بازی میں

بغیر اجازت کے یہ سارا علاقہ کیوں فتح کیا۔ طارق نے ایک فرماں بردار جرنیل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ میرے آقا یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے اور آپ کو مبارک ہو۔ یہ سن کر موسیٰ کچھ ٹھنڈا ہوا اور بعد ازاں دونوں نے مل کر مزید فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔

بلاشبہ طارق بن زیاد بھی ایک انسان ہی تھا جس کی بنا پر اس سے فرشتوں جیسی توقعات رکھنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دل میں بھی اپنے حاکم سے کسی مناسب وقت میں بدلہ لینے کی آرزو گھر کر گئی اور وہ اسی سلسلے میں کسی مخصوص موقع کی تلاش میں تھا جو اسے کچھ عرصے بعد مل گیا۔ اس واقعے کا لب لباب یہ ہے کہ قبل ازیں جب طارق نے راڈرک کو عبرت ناک شکست دے کر اس کے دارالحکومت طولیدو پر قبضہ کیا تو وہیں سے اس نے ایک بھاگتے ہوئے پادری کو پکڑا جو مذکورہ سلیمانی میز کے ساتھ وہاں سے غائب ہونے کے چکر میں تھا۔ طارق نے یہ میز اپنے قبضے میں لے کر محفوظ کر لی۔ بعد میں جب موسیٰ بن نصیر کی طارق سے ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اس عظیم جرنیل سے کوئی باعزت سلوک نہ کیا۔ اس صورت حال سے طارق دل برداشتہ ہوا جو بہرحال ایک قدرتی عمل تھا۔ بعد ازاں جب طارق نے یہ میز موسیٰ کو پیش کرنی تھی تو اس نے نہایت صفائی سے اس کی ایک ٹانگ علیحدہ کر کے نقلی ٹانگ لگا دی۔ یہ اصلی ٹانگ اس نے اپنے پاس چھپا لی تھی۔ اندلس فتح کرنے کے بعد جب موسیٰ بن نصیر طارق کے ہمراہ دمشق میں مسلم خلیفہ کے سامنے پیش ہو کر مال غنیمت اور تحفے تحائف کی نمود و نمائش کرنے لگا تو اس سامان میں یہ سلیمانی میز سب سے نمایاں چیز تھی۔ اسی تناظر میں موسیٰ بن نصیر نے اندلس کی تمام تر فتوحات کا صلہ اپنے سر باندھنے کی خاطر خلیفہ کے سامنے طارق کی کوششوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ موسیٰ نے اس مجمعے میں اسے پچھلی صفوں میں کھڑا کر دیا تھا۔ طارق کو موسیٰ کی جانب سے ایک بار پھر اپنی یہ

تذلیل بہت گراں گزری۔ اس نے چلّا کر خلیفہ کے سامنے اپنی روداد بیان کی اور اس کے ثبوت کے لیے سلیمانی میز کی چوتھی اور اصلی ٹانگ بھی پیش کی۔ یہ منظر دیکھ کر سارا دربار ہکا بکا رہ گیا۔

اس ساری صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی اور رنگ میں بھنگ پڑنے کا انجام بھی نہایت افسوس ناک تھا۔ اب اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہہ لیجیے کہ خلیفہ الولید بھی اپنے رتبے کے لحاظ سے سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت سے عاری تھا۔ بجائے اس کے وہ اس صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے دانشمندانہ انداز سے خوش اسلوبی کے ساتھ معاملے کو سنبھال لیتا لیکن اس کے برعکس اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بلکہ نہایت ذلت آمیز طریقے سے ہزاروں آدمیوں کے مجمعے کے سامنے موسیٰ کو دربار سے نکال باہر کیا۔ تاریخ کی کئی کتب میں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا یہ ہیرو اور فاتح اندلس عمر کے آخری حصے میں حجاز مقدس کی وادی القریٰ کے ایک کونے میں بیٹھا بھیک مانگ کر پیٹ کی آگ بجھایا کرتا تھا۔ قابل افسوس امر یہ ہے کہ خلیفۂ وقت کی جانب سے ایسا سلوک صرف موسیٰ بن نصیر کے ساتھ ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس واقعہ کے چند سال بعد اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز دن دوسرے نوجوان مسلم ہیرو محمد بن قاسم کو بھی دیکھنے پڑے۔ یہ وہ وقت تھا جب محمد بن قاسم پورا سندھ اور پنجاب فتح کرنے کے بعد ابھی اپنی طوفانی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا کہ سیاسی عداوت کی بنا پر اسے واپس بلا لیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی واپسی کے بعد راجہ داہر کے بیٹے نے سندھ کا ایک بڑا علاقہ مسلمانوں سے واپس چھین لیا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی صدیوں پر محیط تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بہرحال ان سب ناموافق حالات کے باوجود بھی قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمان انسانی ترقی کی معراج تک پہنچ گئے تھے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی اسی عظمت کو بعض مغربی مؤرخین نے بڑے مزے لے لے کر

بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور برطانوی مؤرخ فلپ ہٹی اپنی تالیف ''عربوں کی تاریخ'' میں کہتا ہے کہ: ''مسلمانوں کے دور ہسپانیہ میں ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ میں علم ودانش کے درخشاں ترین ابواب رقم ہوئے۔ آٹھویں سے تیرہویں صدی کے آغاز تک عربی بولنے والے دنیا بھر میں تہذیب وثقافت کے عظیم مشعل بردار تھے۔ انھی کے توسط سے قدیم علم وحکمت اور فلسفہ دریافت ہوا، اس میں اضافہ ہوا اور اس انداز سے پھیلا کہ مغربی یورپ میں تحریک احیائے علوم ممکن ہوئی۔'' ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے کہ: ''قرطبہ کتب خانوں'' مساجد اور محلات کا شہر تھا۔ اس کی تہذیبی ترقی بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی تھی۔ اس کی میلوں لمبی پختہ وشفاف گلیاں رات کی تاریکی میں بھی روشن رہتی تھی۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے سات سو سال بعد لندن کی گلیوں کو روشن کرنے کے لیے ایک بھی عوامی لیمپ موجود نہیں تھا۔ بلکہ صدیوں بعد کے پیرس کا یہ حال تھا کہ بارش میں اگر کوئی گھر سے باہر قدم رکھتا تو گھٹنوں تک کیچڑ سے لت پت ہو جاتا۔ اسی طرح جب اس عہد میں برطانیہ کی دنیا بھر میں معروف شہرہ آفاق آکسفورڈ یونیورسٹی انسانی غسل کے عمل کو ایک کراہت انگیز فعل سمجھتی تھی جبکہ قرطبہ کے سائنسدان پرتعیش حماموں میں نہانے کے مزے لوٹتے تھے۔'' ایک اور مغربی مؤرخ وکٹر رابنسن اندلسی مسلمانوں کی ترقی اور یورپ کی جہالت کا تقابلی نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے: ''غروب آفتاب پر یورپ تاریکیوں میں ڈوب گیا لیکن قرطبہ میں چراغ جل اٹھے۔ یورپ غلیظ تھا مگر قرطبہ میں ایک ہزار حمام قائم تھے۔ یورپ کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں سے بھرا ہوا تھا مگر قرطبہ ہر روز زیر وجامہ تبدیل کرتا۔ یورپ کیچڑ سے لت پت تھا لیکن قرطبہ کی گلیاں پختہ تھیں۔ یورپ کے امراء نام تک نہ لکھ سکتے تھے جبکہ قرطبہ کے سب بچے سکول جاتے تھے۔ یورپ کے پادری بپتسمہ کے موقع پر جو دعائیں مانگتے وہ لکھی ہوئی صورت میں پڑھ بھی نہ سکتے تھے جبکہ قرطبہ کے

معلموں نے اسکندریہ کے طول وعرض کا کتب خانہ کھڑا کر دیا تھا۔''

یہ عمل قابل ذکر ہے کہ اندلسی عہد میں صنعت وحرفت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا جس کی وجہ سے عوام الناس کی خوشحالی میں بھی بے مثال اضافہ ہوا۔ دولت کی اسی ریل پیل کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے یہ خطہ یورپ کا سب سے گنجان آبادی والا علاقہ بن گیا۔ یہاں پر پارچہ بافی' چمڑے کی مصنوعات' کتابوں اور جلد سازی کی صنعت نے بہت تیزی سے فروغ پایا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا اگرچہ چینیوں کے سر ہے تاہم اسے فروغ دینے اور پوری دنیا میں عام کرنے کا اعزاز عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کو جاتا ہے۔ اندلس میں کاغذ سازی کی صنعت نے بہت ترقی کی جس کی بنا پر یہ خطہ کتابوں کی اشاعت و ترویج اور فروغ میں پوری دنیا میں سبقت لے گیا۔ اس سے ملتی جلتی صورت حال آرٹ اور سائنس کے شعبوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں اندلسی مسلمان دنیا کی امامت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس عہد میں فن تعمیر تو اپنی معراج کو پہنچا ہوا تھا۔ اس دور کی تعمیراتی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا اس نکتے پر غور کیجیے کہ جامع قرطبہ کی دوہری محرابوں میں سرخ وسفید رنگ کے پتھر کے بلاکوں کا استعمال نہایت ہی دلفریب انداز میں کیا گیا تھا۔ اس واقعے کو صدیاں گزر جانے کے بعد حال ہی میں شاہ فہد کے دور میں جب مسجد نبوی ﷺ کی توسیع کی گئی تو اس میں بھی بالکل اسی انداز میں سیاہ اور سفید رنگ کے پتھر کے بلاکوں کا استعمال کیا گیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جامع قرطبہ کی تعمیر میں دہری محرابیں استعمال کی گئی ہیں جو آج تک دنیا کی کسی اور عمارت میں نہیں دیکھی گئیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس انوکھے فن تعمیر کی خاص بات یہ تھی کہ جب امام جمعہ کا خطبہ دیتے تو ان کی آواز اس وسیع وعریض مسجد کے ہر کونے میں بہ آسانی پہنچتی تھی۔ کاش کہ اگر آج قرون وسطیٰ کے اسی اندلسی فنِ تعمیر کو حرمین شریفین کی جدید تعمیر وتوسیع میں مکمل طور پر اپنایا گیا ہوتا تو مروجہ لاؤڈ سپیکر اور ساؤنڈ سسٹم کی

محتاجی سے بے نیازی ہوتی۔ اس کا دوسرا بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ آج کے سائنسی دور میں یہ انوکھا طرزِ تعمیر ہماری عظمت رفتہ کا ایک منہ بولتا ثبوت پیش کرتا۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح زرعی ترقی بھی اندلسی معیشت اور تہذیب وتمدن کا ایک اہم ستون تھا۔ مسلمان زرعی ماہرین نے ہر قسم کے بیج بونے کے لیے صحیح وقت کا تعین کیا۔ انھوں نے پیوند کاری کے مختلف طریقوں کے ذریعے زراعت و باغبانی کو خوب ترقی دی۔ اس مقصد کے لیے تعلیم وتدریس کی خاطر سلطنت کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں زرعی مدرسے قائم تھے۔ علاوہ ازیں مختلف خطوں میں واقع نباتاتی تحقیقاتی اداروں اور باغوں میں متعدد تجربات سے مسلمان سائنسدانوں نے بہت پہلے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پودوں کو مضر موسمی اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے کس طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس امر سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندلسی دور حکومت میں تعلیم و تحقیق اور زرعی توسیع وترقی کا نہایت عمدہ اور مربوط نظام موجود تھا۔ مسلمانوں کی اسی زرعی ترقی کا حال بیان کرتے ہوئے جوزف ہیل اپنی تالیف ''عربوں کی تہذیب'' میں یوں رطب اللسان ہے: ''مسلمانوں کے دور حکومت میں ملک کو بے بہا معاشی واقتصادی فروغ حاصل ہوا۔ آبپاشی کے لیے نہری تعمیرات کی بدولت چاول، گنے، کھجور، ناشپاتی، زیتون اور انار جیسے مشرقی پھل اور اجناس مغرب میں پیدا ہونے لگیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے مال ودولت میں خوب اضافہ ہوا اور افریقہ اور ایشیاء میں ان کی تجارت پروان چڑھی۔'' اسی طرح کے خیالات کا اظہار لین پول اپنی تصنیف بعنوان ''ہسپانیہ میں موروں کی تاریخ'' میں کرتا ہے جس میں اس نے مسلمانوں کی سائنسی وفنی مہارت اور ملک میں زرعی ترقی کا بہت اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ سقوط غرناطہ کے بعد اس ملک کی حالت کس حد تک مایوس کن ہوگئی تھی۔

یہاں یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کے جدید مغربی معاشرے

بالخصوص یورپ میں جانوروں کے حقوق اور فلاح و بہبود کی خاطر نہ صرف بے شمار تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں اور بہت سی قانون سازی بھی کی جا چکی ہے۔ ان تنظیموں سے وابستہ متعدد رضا کار اسلامی طریقے سے جانور کو ذبح کرنے کو ایک ظالمانہ فعل جبکہ بجلی کے جھٹکے کے ذریعے جانور کو مارنے کے عمل کو ایک مہذبانہ طریقہ قرار دیتے ہیں۔ ایسے ہی بعض افراد کی نظر میں تو حیوانی حقوق کو انسانی حقوق پر ترجیح دینے کی خاطر تمام حدود و قیود کو پار کر جانا ایک تہذیب یافتہ عمل قرار پایا ہے۔ بدقسمتی سے جو شخص ان کے اس نظریاتی شکنجے میں پوری طرح سے فٹ نہیں بیٹھتا اس پر غیر مہذب ہونے کا لیبل لگ جاتا ہے۔ قابل افسوس امر یہ ہے کہ یہ لوگ اسلامی تعلیمات اور تاریخ سے بالکل نا بلد ہیں۔ بلاشبہ حیوانات پر اسلام کی نظر شفقت اسلامی تہذیب کا ایک دلکش پہلو ہے اور یہ امر اس لیے بھی اہم ہے کہ زمانہ قریب تک تو دنیا کی کوئی بھی حکومت یا کوئی بھی انسانی تہذیب اس کا تصور تک نہ رکھتی تھی۔ بعض اقوام کے ہاں تو اب بھی یہ رواج ہے کہ ورزش، خوشی اور قومی تہواروں کے موقع پر جانوروں کا قتل اور ان کی لڑائی تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آج کے جدید سپین میں بیلوں کی لڑائی اس کی زندہ مثال ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب اس معاملے میں اپنے اصولوں اور طرز عمل کے لحاظ سے ایسے لطیف انسانی شعور کی پیامبر بن کر سامنے آئی جو کسی بھی گزشتہ تہذیب کو نصیب نہ ہوا۔ اندلس میں حیوانات کی فلاح و بہبود کی خاطر سرکاری سرپرستی میں کئی ادارے موجود تھے۔ بعض دستاویزات میں ایسے اوقاف کا سراغ بھی ملتا ہے جو صرف بیمار حیوانات کے علاج کے لیے مخصوص تھے۔ علاوہ ازیں ایسے اوقاف بھی تھے جو صرف بوڑھے جانوروں کے چرنے کے لیے مخصوص تھے۔

درحقیقت اندلس کی مسلم سلطنت میں یہ سرگرمیاں اس وقت جاری وساری تھیں جب پورے کا پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہونے کی وجہ سے جانوروں کے حقوق اور

ان کی فلاح و بہبود کے بارے میں کوئی تصور نہیں رکھتا تھا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ نہ صرف قرونِ وسطیٰ بلکہ انیسویں صدی عیسوی تک مغرب میں کسی حیوان کو اس کے اپنے جرم یا مالک کے جرم کے عوض سزا کا حقدار ٹھہرایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا جیسا کسی عاقل اور صاحب شعور انسان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک حیوان کے خلاف ایسے ہی فیصلے صادر کیے جاتے اور قید و بند کی سزا دی جاتی جیسے ایک مجرم انسان کو دی جاتی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ پندرہویں صدی میں ایسا ہوا کہ اندلس کے پڑوسی ملک فرانس میں چوہوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا۔ ان بے چاروں پر الزام یہ تھا کہ وہ مجمعے کی صورت میں خوفناک انداز سے گلی کوچوں میں جمع ہو جاتے ہیں جس سے لوگوں کے سکون میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ چوہوں کے دفاع کے لیے اس ملک کا ایک مشہور وکیل میدان میں اترا۔ اس نے عدالت سے مہلت مانگی کہ اس وقت چوہے حاضری سے قاصر ہیں کیونکہ ان میں سے بعض بچے بوڑھے اور بیمار ہیں۔ اس انوکھی عدالت نے بھی اپنے مخصوص انصاف کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ وقت تک کے لیے مہلت دے دی مگر چوہے پھر بھی حاضر نہ ہوئے۔ اس پر وکیل صفائی نے یہ جواز پیش کیا کہ چوہے تو بخوشی عدالت میں پیشی کے لیے تیار ہیں تاہم انھیں راستے میں بلیوں سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ اس پر فاضل جج نے حکم صادر کیا کہ تمام بلیوں اور کتوں کو مقررہ وقت کے لیے بند کر دیا جائے تاکہ چوہوں کو عدالت میں حاضری کے دوران جان کی امان حاصل ہو سکے۔ جب عام شہریوں نے اس حکم نامے پر کان نہ دھرے تو عدالت نے فیصلہ سنا کہ چوہوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے کیونکہ موجودہ صورت حال میں انھیں عدالت میں حاضری سے زبردستی محروم رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مذکورہ وکیل کو اس انوکھے مقدمے

پیروی سے بے پناہ شہرت حاصل ہوئی تاہم یہ بات صیغۂ راز میں ہی رہی کہ اس نے چوہوں سے اپنی ان خدمات کی فیس کتنی مقدار میں وصول کی۔ بعض لوگوں کے خیال میں اس نے یہ کام کارِ خیر سمجھ کر کیا تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس مقدمے کے بعد چوہوں نے اپنے اس محسن کی کتابوں' کاغذات اور کپڑوں کو کترنا بند کر دیا ہو۔

اندلس میں مسلمانوں کی تہذیبی' معاشی و معاشرتی' سائنسی اور فنی ترقی کے ضمن میں یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں غیر مسلموں بالخصوص عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ نہایت رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ جس کی بنا پر انھیں پھلنے پھولنے اور ترقی کے مساوی مواقع میسر تھے۔ اس عہد نے نہ صرف کئی نامور یہودی سائنسدان پیدا کیے بلکہ انھیں اعلیٰ ترین سرکاری اور درباری اعزازات اور ملازمتوں سے بھی نوازا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کو یہودی اپنا سنہری دور سمجھتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے فوراً بعد ہی مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کر کے ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے گئے۔ ابھی مسلمانوں کے انخلا پر اُڑنے والی خاک فضا میں موجود تھی کہ ان کے تمام آثار و علامات کو ختم کر کے انھیں زبردستی عیسائی بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ یہ سلسلہ آنے والی چار پانچ دہائیوں تک جاری رہا۔ آخر کار ۱۵۵۲ء میں فلپ دوم نے بچے کھچے مسلمانوں کا مکمل صفایا کرنے کی خاطر ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ فوراً اپنے عقائد' زبان' عبادت کے طریقے اور طرز زندگی کو کلی طور پر تبدیل کر لیں۔ علاوہ ازیں اس نے مسلمانوں کے تمام حماموں کو تباہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس کے خیال میں یہ اسلامی علامت عیسائی عقیدے سے متصادم تھی۔ ۱۶۰۹ء میں فلپ سوم نے حکم نامہ جاری کیا کہ کسی مسلمان کو سپین میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ برطانوی مؤرخ فلپ ہٹی کے مطابق اس حکم نامے کے بعد پانچ لاکھ بچے کھچے مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ملک سے باہر ہانک دیا گیا۔ ان میں سے کئی

لوگوں نے شمالی افریقہ جبکہ دوسروں نے مشرقی وسطیٰ میں پناہ لی۔ فلپ ہٹی کی تحقیق ثابت کرتی ہے کہ سقوط غرناطہ کے بعد کی دو صدیوں کے دوران تقریباً تیس لاکھ مسلمانوں کو یا تو زبردستی بے یارومددگار جلاوطن کیا گیا یا پھر قتل کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے یہ سلسلہ وہیں ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ ہنوز جاری ہے اور آج کے جدید عالمگیریت کے دور میں فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

بلاشبہ سقوط غرناطہ کا نقصان ناقابل تلافی تھا اور اس کا خمیازہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی امت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ جرمن مؤرخ وان کریمر مسلمانوں کے زوال کو ان کے حکمرانوں کی داخلی لڑائیوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اسلامی مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی تھی اور اس کے فرماں روا آپس میں لڑائی جھگڑوں میں مصروف رہتے تھے۔ قطع نظر ان حالات اور اسباب کے اندلس کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کا شروع کا کافی عرصہ تو ٹھیک ہی گزرا تھا اور ان کی جہدِ مسلسل کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کی بارش کر دی تھی۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ شکر خداوندی بجا لایا جاتا مگر افسوس کہ مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی روش اختیار کی۔ دولت کی ریل پیل کی وجہ سے امراء اور حکمران اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کو بھلا کر عیش وعشرت کے چکروں میں پڑ گئے۔ پھر یہ ہوا کہ ان کی دیکھا دیکھی اس بہتی گنگا سے عوام الناس بھی اپنے حصہ بٹورنے کے لیے مصروف عمل ہو گئے۔ اس سارے سلسلے میں دو مخصوص برائیوں کی آمیزش نے مسلمانوں کی تباہی کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ ان میں اول الذکر تھی 'ام الخبائث' یعنی شراب نوشی کا عام ہونا اور دوسرے شطرنج کے کھیل کا حد سے زیادہ مقبول عام ہو جانا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں برائیوں کے بڑھنے کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مسلمان ریاستوں کے حکمران اور شہزادے ہمسایہ عیسائی ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنے ہاں شطرنج کی دعوتوں پر مدعو کرنے لگے۔ ان

ناپاک محفلوں میں غلام اور لونڈیاں اپنے ہاتھوں میں مئے سے بھرے جام تھامے ہر وقت خدمت کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس ساری صورت حال کا نتیجہ واضح تھا۔ عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں کی ان کارستانیوں اور خرمستیوں سے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ انھیں آپس میں لڑانے لگے۔ یہ عمل اپنے عروج کو اس انداز سے پہنچا کہ طوائف الملوکی کی وجہ سے بعد کے زمانے میں عظیم الشان مسلم سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ یہ علاقائی مسلمان حکمران آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر ہمسایہ عیسائی ریاستوں سے بھاری تاوان کے عوض فوجی مدد لینے لگے۔ بالآخر اس سارے سلسلے کا جو آخری اور افسوس ناک انجام ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

میں آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر براجمان اندلسی تاریخ کے سمندر میں کھویا ہوا تھا اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ اچانک طیارے کے کپتان نے اپنی ہسپانوی نژاد انگریزی میں بہ آواز بلند اعلان کیا کہ تقریباً دو تہائی سفر گزر چکا ہے اور اس وقت ہم فرانس کے اوپر محو پرواز ہیں۔ اعلان کی اس تندی و تیزی نے میرے کانوں کے پردے پھاڑتے ہوئے مجھے زبردستی آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ اس میں مجھے ماضی کی کئی صدیاں ایک ہی جست میں پھلانگتے ہوئے زمانۂ حال میں کودنا پڑا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ فضا سے زمانۂ حال پر ابھی ایک طائرانہ نظر دوڑائی ہی تھی کہ امت مسلمہ کی مروجہ صورت حال دیکھ کر اور بھی دکھ ہوا اور میں خود اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ: ''او مسلمان کیا آج پھر تو وہی غلطیاں تو نہیں دہرا رہا جو کل تو نے اندلس میں کیں تھیں؟'' افسوس کہ اس سوال کا جواب مجھے 'ہاں' میں ملا اور تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہراتی ہوئی نظر آئی۔ اللہ نہ کرے کہ ہم ایک اور اندلسی انجام کی طرف رواں دواں ہوں۔

خیر تھوڑی دیر بعد سٹینسٹڈ کے ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد مجبوراً مجھے جہاز اور تاریخی تصورات دونوں کے خول سے باہر نکلنا پڑا۔ ہم تینوں ساتھی ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر نکلے ہی تھے کہ وہاں پر موجود ایک بس کو پہلے سے ہی اپنے انتظار میں پایا۔ ہم اس میں سوار ہو کر سیدھے غریب خانے آ پہنچے۔ اس وقت آدھی رات ہونے کو تھی۔ میرے دونوں ہم راہیوں نے چند نوالے اوپر نیچے کیے اور اپنی اگلے دن کی مصروفیات کی خاطر رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ میں نے بھی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ''تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین'' کہتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بلاشبہ میں نے اپنے گذشتہ آٹھ دن ان کے ساتھ بہت ہی اچھے گزارے تھے۔ یہی آٹھ دن میری زندگی کا وہ اثاثہ تھے کہ جن میں مجھے اپنے آٹھ صدیوں پر پھیلے ہوئے شاندار ماضی اور افسوس ناک انجام کی ایک ایسی سبق آموز جھلک دیکھنے کا موقع ملا جس کی خواہش مجھے اپنے بچپن ہی سے تھی۔

ان ساتھیوں کی روانگی کے بعد اور رات کے اس سنسان و پرسکون حصے میں میں ایک بار پھر مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل پر غور کرنے لگ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج کی جدید نسل میں یہ نظریہ بڑا مقبول عام ہے کہ جب بھی کوئی قوم تہذیب وتمدن کی بلندیوں کو چھوتی ہے تو قدرتی طور پر ساتھ ہی ساتھ اپنے لیے زوال کی راہ بھی ہموار کر لیتی ہے۔ اگرچہ سرسری نظر میں دیکھا جائے تو سقوط غرناطہ کے سلسلے میں یہ بظاہر ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اگر گہری نظر سے تاریخ کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام کسی شخص واحد یا کسی مخصوص انسانی گروہ کی اختراع نہیں بلکہ اللہ نے اس دینِ حق کو ہر زمانے کے لیے نازل کیا ہے۔ چنانچہ یہ دوسرے نظاموں یا تہذیبوں کی طرح دنیاوی قوانین عروج وزوال کا تابع کیوں ہو؟ درحقیقت تاریخ کے جن ادوار میں مسلمانوں نے اللہ کے قوانین کی نافرمانی کی یا انھیں نظر انداز کیا تو زوال و

ادبار اُن کا مقدر ٹھہرا مگر جونہی انھوں نے صراط مستقیم کی طرف رجوع کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ فرانسیسی مؤرخ پیری لوتی مسلمانوں کے زوال کے انھی اسباب کو خواب کے زمانے کہتا ہے۔ اس کے خیال میں: ''مسلم دنیا کے موجودہ زوال کو اسلامی نظام سے منسوب کرنا ایک نہایت طفلانہ تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کا اپنا ایک زمانہ ہوتا ہے اور عظیم الشان عہد کے بعد غفلت اور خواب کا وقت بھی آجایا کرتا ہے۔'' بلاشبہ یہی الفاظ مسلمانوں کی کامیابی و ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ امت مسلمہ کے موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اس مشکل وقت میں بھی مایوسی کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قومیں بار بار اپنے ماضی کی طرف پلٹتی ہیں اور تاریخ عالم میں متعدد بار نشاۃ اولیٰ نے نشاۃ الثانیہ کی بنیادیں بھی رکھی ہیں۔ اسی تناظر میں ہمیں بھی ایک بہتر مستقبل کے حصول کی خاطر کمربستہ ہوجانا چاہیے۔

ماضی سے مستقبل کو واپسی

گزشتہ صفحات میں آپ اندلس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان پڑھ آئے ہیں۔ بلاشبہ یہ داستان سقوط غرناطہ پر ہی اختتام پذیر نہیں ہو جاتی بلکہ اوائل اسلام سے ہی ایک تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس ضمن میں اگر غور سے دیکھا جائے تو بدقسمتی سے امت مسلمہ کے موجودہ حالات بھی کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرتے۔ یہ ساری صورت حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو نہ صرف ٹھنڈے دل سے اپنی غلطیوں پر غور کرنا چاہیے بلکہ تاریخ سے بھی سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم آئندہ کے سقوط غرناطہ یا سقوط ڈھاکہ سے بچ سکتے ہیں۔ یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے اس آخری اور اضافی حصے میں امت مسلمہ کی موجودہ دگرگوں حالت اور اس سے منسلک مسائل کے گرداب سے نکلنے کے بارے میں کچھ نہ کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ دراصل اس سلسلے میں قبل ازیں میں اپنے مختلف مقالات میں تفصیلی مباحث' متعدد تجزیے اور تجاویز پیش کر چکا ہوں۔ تاہم چونکہ یہ سب کچھ انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ یہاں صرف اس کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔

دنیا میں عام تاثر یہ ہے بلکہ بے شمار سادہ لوح مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے جو بلاشبہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ بنیادی طور پر اسلام محض پوجا پاٹ کے طور طریقوں کا نام نہیں بلکہ اگر اسلامی تعلیمات کے بنیادی فلسفے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تمام تر توجہ انسانی ترقی کے عمل

کو معراج تک پہنچانے پر مرکوز ہے۔ اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ اقوام متحدہ نے ۱۹۹۰ء میں انسانی ترقی کا نظریہ پیش کیا جو درحقیقت ہنوز ایک ادھوری کوشش ہے۔ وہ اس لیے کہ اس میں انسانی ترقی کے صرف مادی پہلوؤں کو ہی شامل کیا گیا ہے جبکہ روحانی ترقی کے لیے یہاں کوئی جگہ موجود نہیں۔ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اسلام نے اس سے چودہ صدیاں قبل یہی نظریہ اپنی مکمل شکل میں پیش کیا تھا جس میں مادی و روحانی دونوں پہلوؤں کو بھرپور جگہ دی گئی۔ سیرت اور تعلیمات نبوی ﷺ اس کی واضح مثال ہیں۔ اسلام میں پہلی ریاست کی بنیاد ۶۲۲ء میں رکھی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ مدینہ میں آپ ﷺ کا دس سالہ دور حکومت انسانی ترقی و سماجی تحفظ کے نظام کا ایک واضح ثبوت ہے۔ انتظامی امور کے لحاظ سے فلاحی مملکت کا نظام پانچ سطحوں پر مشتمل تھا۔ آپ ﷺ کی سربراہی میں اس سلطنت میں سب سے بالائی سطح پر وفاقی انتظامی مشینری کام کرتی تھی۔ اس سے نچلی سطح پر صوبوں کو عمالت کہا جاتا تھا اور ہر صوبہ کئی نظارتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر نظارت متعدد عرافتوں پر مشتمل ہوتی اور ہر عرافت میں کئی نقابتیں ہوتی تھیں۔ نقابت دراصل سب سے نچلی سطح کا انتظامی یونٹ ہوا کرتی تھی۔ یہ عموماً آٹھ خاندانوں پر مشتمل ہوتی اور ان میں سے کسی ایک خاندان کا سربراہ اس کا منتظم ہوا کرتا تھا۔ تقریباً ایک درجن کے قریب نقابتیں مل کر ایک عرافت کو وجود میں لاتیں اور اس کے سربراہ کو عریف کہا جاتا تھا۔ یہ آج کی یونین کونسل یا تحصیل کونسل سے ملتی جلتی اکائی تھی۔ عریف کو مقامی آبادی سے چنا جاتا اور اس چناؤ کی صوبائی حکومت یعنی ''عمالت'' سے منظوری حاصل کی جاتی تھی۔ عریف مقامی بیت المال اور دیگر سرکاری امور کی انجام دہی کا ذمہ دار ہوا کرتا تھا۔ نظارت دراصل عرافت اور عمالت کے درمیان کی انتظامی اکائی ہوتی تھی۔ جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے یہ آج کے ڈویژن کی ہم پلہ جبکہ انتظامی اختیار میں ضلع

سے ملتی جلتی تھی۔ ہر نظارت تقریباً دو درجن عرافتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اسی طرح کئی نظارتوں کے ملنے سے ایک صوبہ بنتا جسے عمالت کہتے تھے۔ عمالت کی وسعت اور حدود متعین کرتے وقت مقامی معاشی ومعاشرتی حالات اور آبادی کی نوعیت کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ عمالت کا سربراہ عامل کہلاتا تھا۔ یہ بہت بااختیار عہدہ ہونے کی وجہ سے براہ راست مرکزی حکومت کو جوابدہ ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ عامل کوئی منتخب عہدہ نہیں ہوتا تھا مگر اس کے تقرر پر متعلقہ لوگوں اور نامور شخصیات سے مشورہ ضرور کیا جاتا تھا۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترتیب دیا ہوا یہ سارا نظام نہ تو آج کی مغربی جمہوریت کی طرح خالصتاً انتخابات پر ایمان رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی بنیاد آمرانہ اصولوں پر قائم تھی۔ بلکہ ان دونوں کے برعکس درمیانی اور متوازن راہ اختیار کرتے ہوئے اس کی بنیادیں احکام الٰہی کے اطلاق اور باہمی مشاورت کے اصولوں پر قائم کی گئی تھیں۔

خلفاء راشدین کے دور میں اور بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تو اس نظام نے خوب فروغ پایا۔ اس دور میں اسلامی سلطنت آٹھ صوبوں پر مشتمل تھی اور اس وسیع وعریض مملکت کا نظام بطریق احسن چلانے کی خاطر کئی نئے محکمے قائم کیے گئے۔ ان میں سب سے اہم محکمہ عدلیہ کا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے قاضی کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اس سے قبل یہ ذمہ داری خلفاء انجام دیا کرتے تھے۔ اس محکمے نے تیزی سے اتنی ترقی کی کہ اس وسیع وعریض اسلامی سلطنت میں ہر طرف عدل وانصاف کا بول بالا ہونے کی وجہ سے اسے مملکت کا سب سے اہم ستون سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک اور محکمہ ''افتاء'' کے نام سے بھی قائم کیا گیا۔ اس محکمے کا کام محض مذہبی امور میں فتوے جاری کرنا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ہر شعبے بالخصوص سماجی ومعاشی امور میں عوام الناس کی مکمل رہنمائی کرتا تھا۔ تعجب انگیز امر یہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں اس محکمے کا نام ونشان نہیں تاہم چند مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس سے کچھ کچھ ملتا جلتا ادارہ

''سیٹیز نزاڈوائس بیورو'' کے نام سے پایا جاتا ہے جو دور ہی دور سے محض ٹیلی فون پر حاجت مندوں کو زبانی جمع خرچ پر ٹرخا دیتا ہے۔ دوسرے محکموں کی طرح خلافت راشدہ میں وزارت خزانہ بھی مضبوط بنیادوں پر قائم کی گئی۔ یہ وزارت بیت المال کے نام سے معروف تھی اور اس کا سربراہ نہایت ہی اعلیٰ کردار کا شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ غیر مسلموں سے حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ ان سے جزیہ وصول کرتے وقت ان کے زیر ملکیت زمین کی پیداوار اور پیداواری صلاحیت، متعلقہ خاندان میں کام کرنے والے افراد کی تعداد اور اس گھرانے کے تمام جائز اخراجات کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔

عوام کی ترقی وخوشحالی ہر حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں جدید دور کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کی طرح خلافت راشدہ میں نظارت نافع کے نام سے نیا محکمہ قائم کیا گیا۔ اس محکمے کے فرائض میں پلوں، سڑکوں، پولیس سٹیشنوں، سراؤں اور نئے شہروں کی تعمیر شامل تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس محکمے نے بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کو ایک نہر کے ذریعے ملانے کی غرض سے مفصل رپورٹ اور نقشہ جات تیار کیے۔ یہ مجوزہ منصوبہ آج کی نہر سویز سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تفصیلی غور وخوض اور اپنے رفقاء کار سے مشورے کے بعد دفاعی نقطۂ نظر سے بعض خطرات کے پیش نظر اس منصوبے کی منظوری نہ دی۔ دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے اس ابتدائی دور میں مسلمانوں کی بحری قوت اتنی زیادہ نہ تھی جس کی بنا پر خطرہ تھا کہ رومی اس مجوزہ نہر کے ذریعے بحیرہ قلزم میں داخل ہو کر مسلمانوں کے سمندری قافلے لوٹنے کے علاوہ اسلامی سلطنت کے ساحلی علاقوں پر بھی حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اگرچہ ان حالات کی بنا پر اس عہد میں نہر سویز تو نہ بنائی جا سکی مگر اس کی کمی لاتعداد دوسری نہریں تعمیر کر کے پوری کر دی گئی۔ انھی نہروں کی بنا پر بنجر اور بے آب وگیاہ صحرا لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو گئے۔

اسلامی تاریخ میں قرون وسطیٰ کا عہد اپنی خوشحالی اور سائنسی وفنی ترقی کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کی ترقی کی معراج تک پہنچے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے پیش رووں نے بہت پہلے اس عمل کی ٹھوس بنیادیں رکھ دی تھیں۔ خلیفہ مامون الرشید کی مثال لیجیے جو علم اور سائنسی تحقیق کا دلدادہ تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑا ''بیت الحکمت'' تعمیر کیا جس میں ایک عظیم الشان کتب خانے کے علاوہ علماء اور سائنسدانوں کی تعلیم وتربیت اور تحقیق کی خاطر ایک جدید مرکز بھی موجود تھا۔ درحقیقت اگر تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرون وسطیٰ میں خواہ یہ اندلس کی اسلامی سلطنت ہو یا مشرق وسطیٰ کی، مسلمان اس زمانے کے لحاظ سے انسانی تہذیب کی معراج کو پہنچے ہوئے تھے۔ اس عہد کی ایک خاص بات یہ تھی کہ زرعی شعبے نے بے بہا ترقی کی جس سے نتیجتاً اعلیٰ معیار کی خوراک کی فراوانی ہوگئی۔ اس سے نہ صرف عوام کی صحت کا معیار بلند ہوا بلکہ اوسط عمر میں بھی اضافہ ہوا۔ اسی بنا پر بعض مغربی مؤرخین نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کی اسی ترقی کا حال بڑے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

بدقسمتی سے مسلمان اپنی اس ترقی کے تواتر کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ریاستی بندوبست کا جو مبارک نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیا تھا وہ اگرچہ بعد کی صدیوں میں فروغ بھی پاتا رہا لیکن ہوا یہ کہ اس کے بعد کے ادوار میں مسلمانوں کے اندرونی خلفشار اور بیرونی مداخلت کی بنا پر یہ آہستہ آہستہ کمزور ہونا شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمان بھی زوال پذیر ہوتے گئے۔ دوسری دکھ بھری حقیقت یہ ہے کہ اوائل اسلام ہی سے مسلمان داخلی فتنوں کا شکار بھی رہے ہیں۔ یہ عبداللہ بن سبا کی سازشیں ہوں یا حضرت عثمان غنی، حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی شہادتیں' امویوں کے خلاف عباسیوں کی کارروائیاں ہوں یا مجوسیوں اور ملحدوں کی

بغاوتیں، ممالک اسلام میں خانہ جنگیاں اور منگولوں کی مسلم نسل کشی ہو یا پھر شیعہ سنی فسادات، اسلاف پرستی ہو یا میر جعفر اور میر صادق جیسے ننگ ملت، ننگ دین اور ننگ وطن لوگوں کی بہتات، سقوط غرناطہ ہو یا سقوط ڈھاکہ' اسلامی تاریخ ایسے افسوسناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بلاشبہ اپنے دل میں امت کا درد رکھنے والے اکثر حضرات کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ ہم من حیث الامت تمام صفات محمودہ میں تنزل اور جمیع اوصاف مذمومہ میں ترقی کیوں کر رہے ہیں جو ہمیں ہمارے حقیقی مقام، صراط مستقیم اور عظمت رفتہ سے دور لے جانے کا موجب بن رہے ہیں۔ ہماری اجتماعی طاقت، حکومت، دولت، عزت، غیرت، علمی عظمت اور اخلاق فاضلہ ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے بھوک، افلاس، ناخواندگی، عادات مذمومہ اور تمدنی پستی ہمارے اندر گھر کر چکی ہے۔ ان سب عوامل کا جو ایک مجموعی نتیجہ نکلتا ہے اس کا اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں اور امت مسلمہ کی موجودہ حالت ہمارے سامنے اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس ناگفتہ بہ حالت اور دگرگوں موجودہ صورت حال کا اگر طائرانہ جائزہ لیا جائے تو جو چند بڑے بڑے مسائل سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

یہاں یہ امر بالکل واضح ہے کہ باوجود بے پناہ مادی وسائل کی دستیابی کے پوری مسلم امہ اس وقت شدید عدم تحفظ کا شکار ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ عدم تحفظ زندگی کے ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے۔ جان، مال، عزت، ذریعہ معاش، صحت، تعلیم یا پھر ہماری ثقافتی اقدار سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ بدعنوانی اور بدانتظامی ہماری اجتماعی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے۔ افرادی و مالی وسائل کے انحطاط کی وجہ سے انسانی سرمائے میں فروغ کا عمل برائے نام ہو کر رہ گیا۔ ان حالات نے بیشتر مسلمان ممالک کے اندر معاشی و معاشرتی افراتفری پیدا کر دی ہے۔ تنزلی کے اس سارے عمل کو مزید تیز کرنے

کے لیے عالمی ذرائع ابلاغ اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ انھی ذرائع ابلاغ نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی خاطر تمام اخلاقی حدود وقیود کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ اسی بنا پر اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کو ایک مکافاتی عمل سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ہر مسلمان کو شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے کہ کہیں وہ دہشت گرد تو نہیں۔ علاوہ ازیں بیشتر مسلمان ملکوں کی معاشی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ سال ہا سال سے عالمی بینک، آئی ایم ایف اور دیگر مغربی ممالک کے بھاری قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یہ مقروض ممالک ہر سال اپنے بجٹ کا بڑا حصہ ان قرضوں کے سود کی ادائیگی پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اس ادائیگی کے بعد بقیہ وسائل اتنے نہیں ہوتے کہ ان سے ملکی نظام کو چلایا جا سکے۔ ان حالات میں یہ ملک مزید قرض کے حصول کی خاطر مذکورہ بالا عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ادارے ان ممالک کی بے بسی پر رحم کھانے کے بجائے قرض کی خواہاں حکومتوں سے ایسی کڑی شرائط منواتے ہیں کہ معاشی بدحالی کے شکار یہ ملک مزید پستی کی طرف دھکیل دیے جاتے ہیں۔ اس سارے منحوس چکر میں مصائب کے جو پہاڑ عوام الناس پر ٹوٹتے ہیں ان کا احساس نہ تو ان کے ارباب اقتدار کو ہوتا ہے اور نہ ہی عالمی مالیاتی اداروں کو۔ عالمی مالیاتی نظام کے ساتھ ساتھ اگر عالمی تجارت کے نظام کو دیکھا جائے تو یہ سارے کا سارا بھی حقیقت میں غریب ممالک اور بالخصوص مسلم ممالک کے لیے گھاٹے کا سودا ہے۔ عالمی تجارت میں ویسے ہی مسلم ممالک کا حصہ تیرہ فیصد سے بھی کم ہے۔ مزید غضب یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے درمیان باہمی تجارت کا حصہ محض بارہ فیصد ہے۔ ان حالات میں تمام تر سائنسی ترقی، صنعت، ہتھیاروں کی پیداوار اور فروخت، عالمی مالیاتی نظام اور عالمی تجارت پر اہل مغرب کی مکمل اجارہ داری کی بنا پر مسلم ممالک بالکل بے بسی کی حالت میں زندگی گزار رہے

ہیں۔ بلا شبہ ایسے حالات نہ صرف داخلی عدم استحکام کا موجب بنتے ہیں بلکہ بیرونی مداخلت کی راہ ہموار کرنے میں بھی مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے اطراف کا جائزہ لیں تو یہ سب کچھ ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور زمانۂ حال کے زوال و اِدبار کا نقشہ ایک مشہور مسلمان عالم ابوسلیمان ان الفاظ میں کھینچتا ہے: ''اندورنی طور پر کمزور، پس ماندہ، بے چین و بے بس، فسادات سے پر اور عموماً بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر چلنے والی مسلم دنیا آج بہت تکلیف دہ دور سے گزر رہی ہے۔ آج مسلمانوں کے لیے تمام جدید عالمی تاریخ ایک المیے سے کم نہیں۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب مسلمان اپنی تہذیبی وتمدنی ترقی کی بنا پر دنیا کی امامت کا فریضہ سر انجام دیتے تھے۔ مگر آج اس کے برعکس تمام عالمی مسائل کا ذمہ دار انھیں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ حالات کیسے پیدا ہوگئے اور انھیں کیسے بدلا جا سکتا ہے۔'' ابوسلیمان مزید کہتا ہے کہ: ''ہماری کمزوری یہ ہے کہ مسلم ممالک میں یہ ایک راویت بن چکی ہے کہ وہ اپنے تمام مسائل کا الزام بیرونی عناصر پر لگا کر اپنے آپ کو بالکل بری الذمہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ ہماری یہ عادت وقتی طور پر تو شاید ہمیں کچھ طفل تسلی کا سامان مہیا کر دیتی ہے مگر یہ ہماری فاش غلطیوں کے ازالے کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ خود ہمارا اپنا طرز عمل بھی ہماری پستی و پسماندگی کا ایک اہم سبب ہے۔ ہماری انھی کمزوریوں کی وجہ سے بیرونی عناصر کو ہمارے داخلی امور میں مداخلت کے ذریعے ہمارے اندرونی خلفشار کو ہوا دینے کا خوب موقع ہاتھ آیا ہے۔ بلاشبہ ان داخلی اور خارجی مسائل سے عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کر کے بھتری کی قابل عمل تدابیر پر عمل پیرا نہ ہوا جائے۔''

ابوسلیمان کی یہ تصویر کشی ہم سے بہت کچھ سوچنے کا تقاضا کرتی ہے۔ قابل افسوس امر یہ ہے کہ عالمگیریت کے اس جدید دور میں بعض جید مسلم علماء بھی تخیلاتی دنیا میں

رہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کی بنیاد پر انھیں تابناک مستقبل کا مژدہ تو سنا دیتے ہیں مگر یہ بتانے سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ اس عظمت رفتہ کا ازسرنو حصول کیسے ممکن ہے۔ دوسری طرف بدقسمتی یہ ہے کہ آج دنیا کے تمام مسلم ممالک میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جسے دوسروں کے لیے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ تاہم اس سارے عمل میں اسلامی نظام کو کسی طور پر بھی موردالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ اس کا تو کہیں بھی اطلاق نہیں کیا جا رہا۔ درحقیقت یہاں ایک اہم مسئلہ ہمارے ارباب اقتدار کا ہے جو امت مسلمہ کے بڑے بڑے مسائل کی روح کو سمجھنے سے یا تو قاصر ہیں یا پھر ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً پورا عالم اسلام غربت بھوک، ناخواندگی اور سماجی ناانصافی جیسے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ انھی مسائل کے مجموعے اور طویل تسلسل نے نہایت پیچیدہ شکل اختیار کر کے عدم تحفظ کی فضا کو فروغ دیا ہے۔ اس صورت حال سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے کئی مسلم نوجوان مذہبی انتہا پسندی کی گود میں جا گرے ہیں۔ آج کل ہمیں اپنے چاروں طرف جو افراتفری، خودکش حملے اور مار دھاڑ نظر آرہی ہے یہ بنیادی طور پر انھی افسوس ناک حالات کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ یہ حالات حکمت عملی سے کی گئی منصوبہ بندی کے ذریعے فوری سدباب کا تقاضا کرتے ہیں۔

عالمی اعداد و شمار دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آبادی اور کرۂ ارض کے رقبے کے لحاظ سے مسلمان دنیا کا تقریباً ایک چوتھائی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر شمال مغربی افریقہ تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا بحرالکاہل، بحراوقیانوس، بحر ہند، بحیرہ روم، بحیرہ قلزم اور بحیرہ عرب سے بغلگیر ہونے کی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی بڑی آبی گزرگاہوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ نہر سویز ہو یا آبنائے ہرمز، آبنائے ملاکہ ہو یا آبنائے باسفورس یا پھر آبنائے جبل الطارق سب عالم اسلام کا حصہ ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مسلم ممالک دنیا کا تقریباً دو تہائی تیل، گیس، ربڑ، پٹ سن، مصالحہ جات، ٹن اور فاسفیٹ

پیدا کرتے ہیں۔صرف یہی نہیں مسلم دنیا بے بہا کاٹن، چائے، کافی اور اون پیدا کرنے کے علاوہ یورینیم، مینگانیز، کوبالٹ اور متعدد دیگر معدنیات کے خزانے بھی اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ تاہم بدقسمتی یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی عالم اسلام غیر مسلم دنیا سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔آخر یہ پسماندگی ہمارے ہی مقدر میں کیوں لکھی گئی ہے اور اس فلاکت، زبوں حالی، پسماندگی و بدحالی کے ان حالات سے نکلنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

انتہائی قابل افسوس امر یہ ہے کہ کئی مسلمان ممالک اندورنی خلفشار کی بنا پر داخلی عدم تحفظ یا خانہ جنگی کی سی صورتحال کا شکار ہیں۔افغانستان،عراق،سوڈان،فلسطین اور ہمارے اپنے پیارے وطن پاکستان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔بلاشبہ زندگی کی بنیادی ضروریات کی عدم دستیابی اور جان و مال اور عزت کے عدم تحفظ کی فضا انسانی ترقی کے عمل کے لیے ہرگز سازگار نہیں ہوسکتی۔ عالمگیریت کے اس دور میں امت مسلمہ کی یہ پریشان کن صورت حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اگر ہم اپنے حالات میں واقعی بہتری کے خواہاں ہیں تو ہمیں کئی قسم کے فوری اور ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو امت مسلمہ کی بہتری کی خاطر ایسی کوششیں چار سطحوں پر کرنے کی ضرورت ہے۔سب سے پہلے تو امتِ مرحومہ کے ہر فرد کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے خود اپنے آپ کو فعال بنانا ہوگا۔ میں یہ بات زور دے کر تاکیدی لہجے میں کہنا چاہوں گا کہ ایسی مجوزہ تبدیلی کے عمل کا آغاز ہر انسان کو اپنی ذات سے شروع کرنا چاہیے۔ ورنہ اس سلسلے میں تمام ذمہ داری کسی مخصوص تنظیم یا حکومت پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جانا حقائق سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے۔ انفرادی عمل کے بعد اگلا مرحلہ تنظیمی سطح پر مربوط اور سلسلہ وار کوششوں کا ہے اور اس کے بعد متعلقہ حکومت کا نمبر آتا ہے۔ المختصر یہ کہ اندلس کے اس سفرنامے کو طوالت سے

بچانے کی خاطر یہاں ہم ان امور کی تفصیل میں جانے سے قاصر ہیں لہٰذا یہ مباحث وتجزیے کسی اور موقعے پر پیش کیے جائیں گے۔ البتہ اس سلسلے میں سب سے بالائی سطح کی کوشش جو سب مسلمان حکومتوں کو اکھٹے ہو کر اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے پلیٹ فارم سے کرنی چاہیے اس کا مختصر سا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا سارے تناظر میں دیکھا جائے تو دوسرے اقدامات کے علاوہ مسلم ممالک میں اتحاد اور یکجہتی کے فروغ کی خاطر اسلامی کانفرنس کی تنظیم کو مضبوط بنانا اشد ضروری ہے۔ آج اگر ہم دوسری بین الاقوامی تنظیموں اور بالخصوص یورپی برادری کو دیکھیں تو یہ نہ صرف مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہیں بلکہ روز بروز نئے نئے ممالک کے شامل ہونے کی وجہ سے پھیل بھی رہی ہے۔ اس برادری میں شامل کئی ممالک ایسے ہیں جو اپنی تہذیب و ثقافت کے اختلاف کی وجہ سے چند دہائیاں قبل تک باہم دست و گریباں رہے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مسلم ممالک کو دیکھا جائے تو کئی امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بھی وہ مشترکہ تہذیب و تاریخ اور ایک ہی دین کے پیروکار ہیں جو حقیقت میں سب سے بڑا مشترکہ اثاثہ ہے۔ یہی وہ عامل ہے جو امت مسلمہ کے اتحاد و یگانگت میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے پیش نظر اسلامی کانفرنس کی تنظیم کو مضبوط اور فعال بنانا عہد حاضر کا ایک بہت ہی اہم تقاضا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت یہ تنظیم ایک بہت ہی کمزور اور غیر مؤثر ادارہ ہونے کی وجہ سے کئی قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مسلم ممالک میں یکجہتی کی کوششیں اس وقت تک خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں کرسکتیں جب تک ان میں معاشی فوائد کے حصول کا پہلو بھی شامل نہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان ممالک کو سب سے پہلے قدم کے طور پر باہمی تجارت کو فروغ دینا ہوگا۔ اس عمل میں اسلامی ترقیاتی بنک کا کردار نمایاں

ہونا چاہیے۔ باہمی تجارت کا فروغ اور اسلامی ترقیاتی بنک کی مضبوطی مسلم ممالک میں خود اعتمادی کی فضا کو فروغ دینے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ بلاشبہ باہمی تجارت کا یہ فروغ دوسرے شعبوں میں تعاون کے لیے بھی ٹھوس بنیادیں فراہم کرے گا۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس مرحلہ وار بھائی چارے کی مضبوطی کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا کہ مسلم دنیا نہ صرف اپنے مسائل خود حل کرنے کے قابل ہو سکے گی بلکہ دنیا کے دوسرے خطوں کے مسائل کے حل میں بھی عالمی برادری کی کوششوں میں ایک مؤثر اور فعال رفیق کار بن کر ابھرے گی۔ تاہم اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ اس عظیم مقصد کے حصول کی خاطر مسلم ممالک کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ذیلی اور ملحقہ اداروں کو نہ صرف مضبوط اور مؤثر بنانا ہوگا بلکہ بہت سے نئے ادارے بھی قائم کرنے ہوں گے۔

اگر اس تنظیم کے موجودہ نظام کو دیکھا جائے تو اس وقت جو بڑے اور اہم ادارے کام کر رہے ہیں ان میں اسلامی ترقیاتی بنک، اسلامک چیمبر آف کامرس، صنعت اینڈ کموڈٹی ایکسچینج، اسلامی مرکز برائے فروغ تجارت اور اسلامی فاؤنڈیشن برائے سائنس ٹیکنالوجی و ترقی اور اسلامی ابلاغیات کی دو ایجنسیاں شامل ہیں۔ آج کے عالمی حالات میں اگر مسلم امہ کی ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ادارے نہ صرف اپنا بھرپور کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں بلکہ تعداد میں بھی کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف موجودہ اداروں میں ازسرنو جان ڈالنے کی ضرورت ہے بلکہ کئی نئے اداروں کا قیام بھی اشد ضروری ہے۔ بالخصوص مسلم ممالک کو قرضوں کے بھاری بوجھ اور غربت کی منحوس چکی سے نکالنے کے لیے اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے تحت دو نئے اداروں کا قیام ناگزیر ہے۔ ان میں سے پہلا ادارہ مسلم مالیاتی فنڈ جبکہ دوسرا انسانی ترقی کا فنڈ کے نام سے قائم کیا جانا چاہیے۔ آئی ایم ایف کی طرز پر اول الذکر کا کام مسلم ممالک کی معیشت کو

سہارا دینا ہوگا تاہم آئی ایم ایف کے برعکس یہ بلاسود قرض حسنہ جاری کرے گا۔ مؤخر الذکر ادارے کا مقصد مسلم ممالک میں غربت کے خاتمے کے لیے متعدد پروگرام شروع کرنا ہوگا۔

کئی مسلم ممالک میں داخلی انتشار کی بنا پر انسانی تحفظ کی صورتحال بہت ہی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ان ممالک میں غیر ملکی افواج کی موجودگی اور عالمی ذرائع ابلاغ کے منفی پروپیگنڈے نے نہ صرف ان ممالک بلکہ پوری مسلم دنیا کے حالات کو مزید خراب کر دیا ہے۔ یہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ دو مزید محاذوں پر بھرپور کوششوں کو فروغ دیا جائے اور مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے تین نئے ادارے قائم کیے جائیں۔ آج ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسلم ممالک کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی کوئی شنوائی نہیں۔ اسی طرح عراق اور افغانستان میں اتحادی فوج کی کھلی من مانیاں اور دیگر اسلامی ممالک میں وہاں کے اندرونی حالات خراب کرنے کی خاطر بعض مغربی خفیہ ایجنسیوں اور حساس اداروں کی پوشیدہ سرگرمیاں بھی ایک بیّن حقیقت ہے۔ ان ناجائز کارروائیوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے عالمی ذرائع ابلاغ پوری مستعدی کے ساتھ ساری دنیا میں خوب ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ اس سارے عمل میں مسلم ممالک بالکل عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں۔

مندرجہ بالا نقصان دہ اور پیچیدہ صورتحال کے تدراک کی غرض سے یہ اشد ضروری ہے کہ امت مسلمہ اپنی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کو اولین ترجیح دے۔ اس سلسلے میں جغرافیائی سرحدوں کے تحفظ کے لیے دو نئے اداروں کا قیام ضروری ہے۔ مسلمان ممالک کو چاہیے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرز پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے تحت وہ اپنی علیحدہ مسلم سلامتی کونسل قائم کریں۔ اسی طرح نیٹو اور

اتحادی افواج کے متبادل کے طور پر انھیں مسلم دفاعی فوج کا قیام عمل میں لانا ہوگا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر کسی مسلم علاقے میں حالات خراب ہوں تو وہاں فوراً مغربی افواج کو دعوت دینے کے بجائے مسلم دفاعی فوج کا استعمال کیا جا سکے۔ بلاشبہ ضرورت پڑنے پر یہ مسلم فوج غیر مسلم فوج کی نسبت حالات کو سلجھانے کے عمل میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ تاہم موجودہ عالمگیریت کے دور میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے کہ محض طاقت کا استعمال ہی ہر مسئلے کا مکمل حل نہیں بلکہ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع ابلاغ کا مؤثر استعمال بھی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے آج مغربی ذرائع ابلاغ کے عالم اسلام کے بارے میں منفی پروپیگنڈے کے سیلاب کے سامنے مسلم ذرائع ابلاغ کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بی بی سی اور سی این این یا پھر وائس آف امریکہ جیسے ادارے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلم ممالک مستقبل میں بھی آنکھیں بند کیے اپنے آپ کو محض حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنا پسند کریں گے یا پھر کچھ نہ کچھ بہتری کے خواہاں ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں مسلمانوں کو ایک نئی مسلم نیوز ایجنسی قائم کرنا ہوگی۔ اپنی مضبوطی اور مستعدی کے لحاظ سے یہ ایجنسی کسی طرح سے بھی بی بی سی یا سی این این سے کم تر نہیں ہونی چاہیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے پروگرام اور خبریں پوری دنیا بالخصوص مسلم ممالک اور مغربی دنیا کے تمام ٹیلی ویژن نیٹ ورکس پر فیس کی وصولی کے بغیر ہی دکھائی جانی چاہییں۔

اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے تحت دو مختلف نیوز ایجنسیاں کام کر رہی ہیں تو پھر اس شعبے میں کسی تیسرے اور نئے ادارے کے قیام کا کیا جواز ہے؟ دراصل حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایجنسیاں اس قدر چھوٹی اور بے اثر ہیں کہ

دنیا میں بہت کم لوگ ہی ان کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اداروں کو ختم کر کے مجوزہ مسلم نیوز ایجنسی میں ضم کر دیا جائے۔ یہاں یہ امر خاص طور پر قابل غور اور مسلمانوں کے لیے ایک اُبھرتا ہوا لمحۂ فکریہ ہے کہ عالمگیریت کی موجودہ لہر اور پھر 11 / 9 کے بعد کے حالات مسلم ممالک کو ایک بار پھر نو آبادیاتی نظام کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اس تناظر میں تمام عالم اسلامی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ بہتری کے اقدامات کی خاطر مختصر، درمیانی اور طویل مدت کی ایک جامع منصوبہ بندی کی جائے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ایسی تمام تر کوششیں صرف اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے پلیٹ فارم سے کرنا ہی مناسب ہو گا۔ اگرچہ عام تاثر یہ ہے کہ یہ تنظیم ایک غیر مؤثر ادارہ ہونے کی وجہ سے محض مذاکرات اور بیان بازی تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے جب کہ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ حالات میں مسلم ممالک کے پاس اس کا کوئی نعم البدل بھی تو موجود نہیں ہے۔

میں اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب بعنوان ''امت مسلمہ کے مسائل اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم نو'' میں تفصیلی تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلم ممالک کو اپنے بہتر اور باعزت مستقبل کی خاطر کئی ٹھوس اقدام ناگزیر طور پر کرنا ہوں گے۔ یہاں اس ضمن میں طوالت سے بچتے ہوئے محض چند نکات مختصراً پیش کیے جا رہے ہیں۔ مذکورہ سلسلے کی تمام کوششوں میں سب سے پہلے تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کے بدلے ہوئے حالات اور مسلم ممالک کو درپیش نئے اور پیچیدہ مسائل کی مناسبت سے اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے دستور میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ مزید برآں بعض مخصوص مسلم ممالک کو بھی اپنا طرز عمل تبدیل کرنا ہوگا۔ وہ اس لیے کہ یہ ممالک اس تنظیم کے اخراجات کی مد میں اپنے ذمہ واجب الادا سالانہ چندہ نہیں دیتے جبکہ اس کے برعکس وہ اس ادارے سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ان

حالات میں تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں امت مسلمہ کی مجموعی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ عالم اسلام سے غربت کے خاتمے، مضبوط مالیاتی نظام کے قیام اور باہمی تجارت کے فروغ کے لیے انسانی ترقی کے فنڈ، مسلم مالیاتی فنڈ اور اسلامی مشترکہ منڈی جیسے اداروں کے قیام کی بھی اشد ضرورت ہے۔ انھی عوامل کے فروغ کے پیش نظر یورو کی طرز پر اسلامی دینار کا اجرا بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔ ان مالی اور تجارتی اداروں کے علاوہ مسلم دفاعی فوج، مسلم سلامتی کونسل اور مسلم نیوز ایجنسی کا قیام بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اس نکتے پر زور دیا جاچکا ہے کہ یہ تمام تر کوششیں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوں گی۔ اس سارے عمل کو تکمیل تک پہنچانے اور پھر اس سے مزید فوائد کے حصول کے لیے اسے اور بھی آگے بڑھاتے ہوئے تین مرحلوں کی منصوبہ بندی درکار ہوگی۔ ان تینوں مراحل میں پہلے کو قلیل مدتی منصوبہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ مجوزہ منصوبہ ۲۰۱۱ء سے شروع ہوکر ۲۰۲۰ء میں مکمل ہوگا۔ دوسرا یا درمیانی مدت کا منصوبہ اگلی دہائی پر پھیلا ہوگا اور یہ ۲۰۲۱ء میں شروع ہوکر ۲۰۳۰ء میں اختتام کو پہنچے گا۔ اس سلسلے کا آخری طویل المدتی منصوبہ ۲۰۳۱ء اور ۲۰۵۰ء کی درمیانی دو دہائیوں پر مشتمل ہوگا۔ قلیل المدتی منصوبے کا بنیادی مقصد امت مسلمہ میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دینا ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے غربت کے خاتمے، مضبوط مالیاتی وتجارتی نظام کے قیام، مسلم سلامتی کونسل، مسلم دفاعی فوج اور مسلم نیوز ایجنسی کے قیام پر تمام تر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔ بلاشبہ اس پہلے مرحلے کی کامیابی اگلے دونوں مراحل کی کامیابی کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کرے گی۔

درمیانی مدت کے منصوبے میں مسلم ممالک کی تمام تر توجہ نہ صرف قلیل المدتی منصوبے میں حاصل کیے گئے نتائج کو مزید آگے بڑھانے پر ہوگی بلکہ ان دس سالوں

میں انھیں اپنی اپنی معیشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے مشترکہ خارجہ پالیسی بھی اپنانا ہوگی۔اس دہائی میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم اسلامی دینار کا اجراء کرے گی اور مسلم ممالک پر بیرونی قرضوں کے بوجھ کو بہت حد تک ہلکا کیا جائے گا۔صنعت وسرمایہ کاری میں اضافے کی خاطر مسلم ممالک کے بنک اور ایوان ہائے صنعت وتجارت اپنے باہمی تعاون کو فروغ دیں گے۔اس کے علاوہ قبل ازیں قائم کیے گئے ادارے مزید مضبوطی و پختگی حاصل کرنے کے بعد امت مسلمہ میں اپنا بھر پور کردار ادا کرنا شروع کر دیں گے۔یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا دونوں منصوبوں کا اصل ہدف مسلم امہ کو مجموعی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ہے۔ بہ الفاظ دیگر معاشیات کی اصطلاح میں آپ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ساری تیاری ''ٹیک آف سٹیج'' کی تیاری کے لیے کی جارہی ہے۔

مذکورہ مراحل کے بعد دوعشروں پر پھیلے ہوئے آخری اور طویل المدتی منصوبے کو درحقیقت امت مسلمہ کی ''ٹیک آف سٹیج'' کہا جانا چاہیے۔اس عرصے میں مسلم ممالک کو اپنی ایک ڈھیلی ڈھالی مگر پائیدار قسم کی کنفیڈریشن عمل میں لانا ہوگی۔یہ کنفیڈریشن چار بنیادی ستونوں پر قائم ہوگی جو حسب ذیل ہیں:

- امت مسلمہ کی مشترکہ کرنسی کا سب ملکوں میں رائج ہونا
- مشترکہ دفاع
- مشترکہ خارجہ پالیسی کا اجراء
- ذرائع ابلاغ کا مشترکہ کنٹرول

چنانچہ اس مرحلے کے اختتام پر اسلامی کانفرنس کی تنظیم ایک مضبوط مشترکہ انتظامی ادارہ بن کر ابھرے گی۔اب ان بدلے ہوئے حالات میں اس ادارے کے سربراہ کا عہدہ تبدیل کر کے اسے سیکرٹری جنرل کی بجائے خلیفہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔تاہم اس ضمن میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس عہدے پر فائز ہونے والی شخصیت دینی و

دنیاوی علوم میں یدطولیٰ رکھنے کے علاوہ انتظامی امور میں بھی یکتا ہو۔علاوہ ازیں اس سلسلے میں یہ بھی مناسب ہوگا کہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا نام تبدیل کر کے اسے ''مسلم یونین'' کہا جائے۔

یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس جمیع پروگرام کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مذکورہ بالا تینوں مراحل اپنے مقررہ نظام الاوقات میں تکمیل کو پہنچائے جائیں۔اگر اس صدی کے وسط تک یہ مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے جائیں تو پھر ۲۰۵۰ء میں امت مسلمہ کی صورت کچھ یوں بنتی ہے کہ اس مرحلہ وار وجود میں آنے والے اتحاد کی بالائی سطح پر ''مسلم یونین'' ایک مشترکہ حکومتی ادارہ ہوگا۔جبکہ اس سے نچلی سطح پر تمام مسلم ممالک اپنے اپنے داخلی امور میں مکمل طور پر خودمختار ہوں گے۔بلاشبہ اس ساری منصوبہ بندی کے لیے بے بہا کام اور تحقیق کی ضرورت ہے۔اس سلسلے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود مسلم عوام اور ارباب اختیار کو قرآنِ حکیم کا یہ فرمان سمجھنا ہوگا کہ اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جسے خود اپنے اندر مثبت تبدیلی لانے کا احساس نہ ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا پروگرام کا خاکہ جاننے کے بعد جو اہم سوال ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سارے نظام کا خرچ کیسے پورا ہوگا۔اس سلسلے میں گزارش یہی کی جاسکتی ہے کہ مسلم ممالک کو یہ بات اچھی طرح سمجھنی ہوگی کہ مذکورہ پروگرام کے اجراء کے لیے انھیں مغربی ممالک سے کسی قسم کی خیرات یا امداد ہرگز نہیں ملے گی بلکہ اس سلسلے کے تمام مطلوبہ وسائل انھیں خود مہیا کرنے ہوں گے۔ان وسائل کی بہم رسانی کی ایک ممکنہ صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے مرحلے کے طور پر تمام مسلمان ملک اپنی اپنی قومی آمدنی کا اعشاریہ صفر ایک فیصد اسلامی ترقیاتی بنک میں جمع کرانا شروع کریں۔اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر یہ عمل ۲۰۱۱ء میں شروع کیا جائے اور ۲۰۲۰ء

تک اس مد میں سالانہ مرحلہ وار طریقے سے اضافہ کر کے اسے ایک فیصد تک بڑھا دیا جائے تو اس ایک عشرے میں ایک سو بلین ڈالر سے زیادہ کی رقم اکھٹی کی جا سکتی ہے۔ اگر اوسطاً دیکھا جائے تو دس بلین ڈالر کی سالانہ اور متواتر اکھٹی ہونے والی رقم امت مسلمہ کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار باب کے آغاز کے لیے کسی لحاظ سے بھی ناکافی نہیں۔ مزید یہ کہ اس سارے عمل سے حاصل ہونے والے فوائد صرف معاشی و معاشرتی میدانوں تک ہی محدود نہیں ہوں گے بلکہ اس سے امت مسلمہ کے اندر جو خود اعتمادی اور وقار پیدا ہوگا اس کی نہ تو کوئی قیمت ہے اور نہ ہی اس کی لذت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ امت مسلمہ کی یہ نشاۃ الثانیہ عالمی امن و آشتی میں بھی نہایت مد و معاون ثابت ہوگی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ایسے حالات میں ہم ایک بار پھر اندلس کے سنہری دور کی طرف لوٹ جائیں گے۔

امت مسلمہ کی موجودہ پریشان کن صورتحال کو دیکھتے ہوئے کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ مندرہ بالا منصوبہ محض ایک سہانا خواب ہی ہو سکتا ہے میرے خیال میں اس کا ممکنہ جواب یہ ہے کہ اگر یہ خواب ہے تو یہ خواب بھی ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں کا ہے جو مشرقی ایشیا سے مغربی افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے ہی کئی خواب حقیقت کا روپ دھارتے بھی دیر نہیں لگاتے۔ دو صدیاں قبل کس نے سوچا تھا کہ شمالی امریکہ کی چار درجن سے زائد ریاستیں مل کر ایک ملک بنا لیں گی اور یہ ملک اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے گا۔ ایک صدی قبل کون تصور کر سکتا تھا کہ یورپ کے دو درجن سے زائد ممالک جن کی تاریخ اور تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے بالکل جدا اور جو صدیوں تک باہم دست و گریباں رہے، مل کر ایک کامیاب اتحاد وجود میں لائیں گے۔ اسی سلسلے میں اگر مسلمان ممالک کے ممکنہ اتحاد کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان ممالک کے عوام میں شمالی امریکہ کی ریاستوں اور

یورپی ممالک کے عوام کی نسبت باہمی اتحاد و یگانگت کی خواہش کہیں زیادہ ہے۔ مزید برآں یہ ممالک مشترکہ تہذیبی، معاشرتی، تمدنی اور تاریخی ورثے کے مالک ہونے کے علاوہ ایک ہی دین کے پیروکار بھی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں سمجھ لیجیے کہ زمین بہت زرخیز ہے بیج بھی موجود ہے اور اب صرف آبیاری کا بندوبست کرنا باقی ہے۔ اللہ کرے کہ ہم یہ انتظام جلد کرنے کے قابل ہو جائیں تاکہ ایک بار پھر دنیا کی امامت کے منصب عالی پر فائز ہونے کے اہل ہو سکیں۔ آمین!
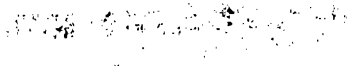
القازار محل کے ایک کمرے کا اندرونی منظر

محل کے وسیع ہال کا داخلی دروازہ

جبل الطارق کا ایک دلکش منظر

دریائے گوادلقویر کے کنارے مسلمانوں کا تعمیر کردہ گول قلعہ نما مینار

اشبیلیہ میں اندلسی مسلمانوں کے تعمیر کردہ شاہی محل

الحمرا میں فتح کے بعد عیسائیوں نے کلیسائی گھنٹی نصب کی

مسلم فلسفی ابن الرشد کے مجسمے کے ساتھ مصنف کی ایک تصویر

جامعہ قرطبہ کے وسط میں تعمیر کردہ گرجے کا ایک منظر
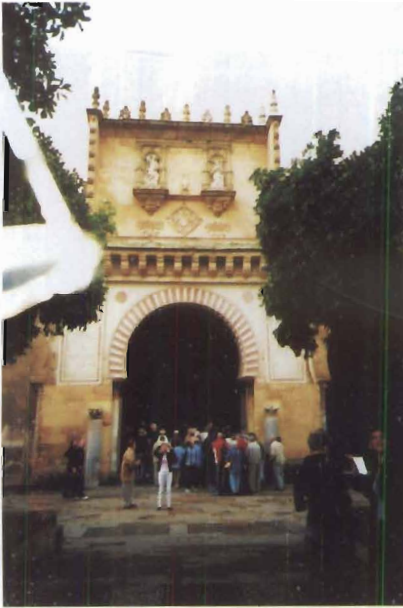
جامعہ قرطبہ کے صدر دروازے پر بعد کے زمانے کے نصب دو بُت
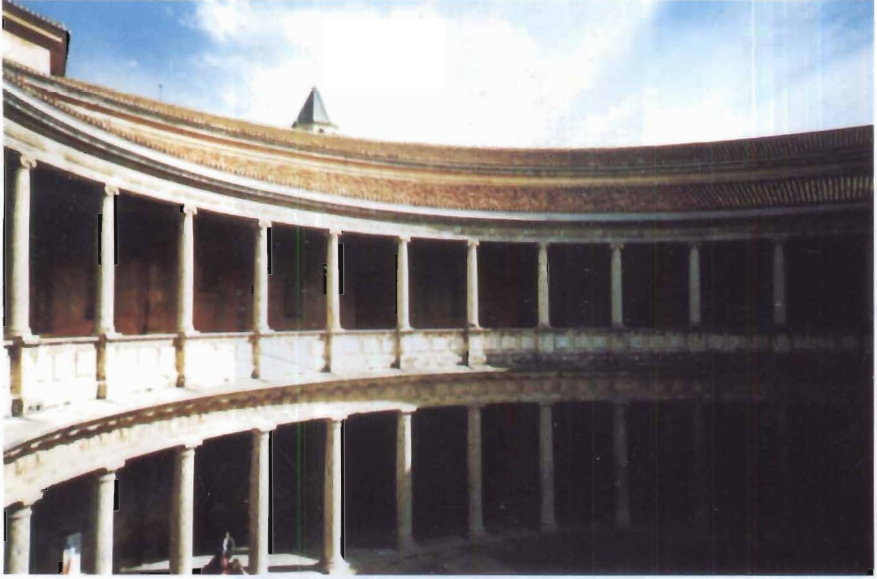
الحمرا کے احاطے میں عیسائی بادشاہوں کا تعمیر کردہ محل
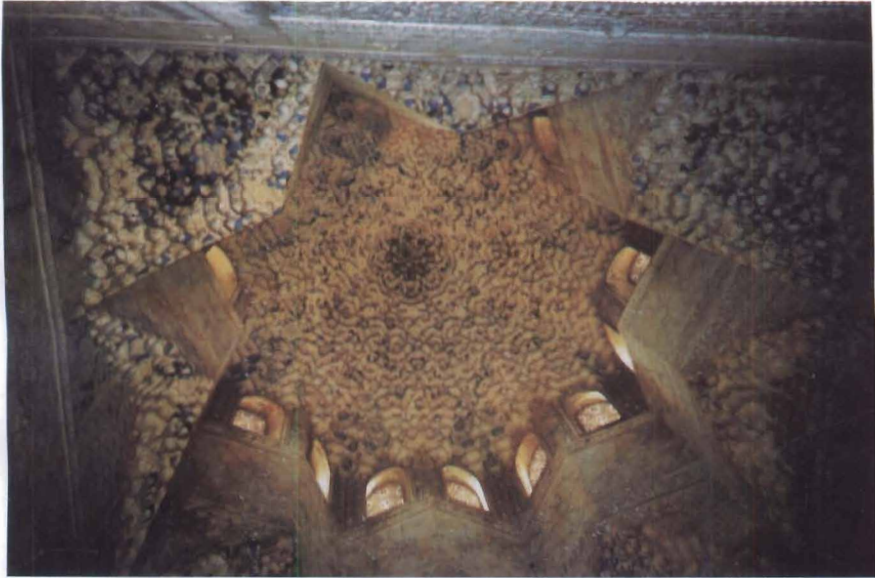
الحمرا کے ایک جنت نظیر گنبد کا اندرونی منظر

موجودہ اشبیلیہ کا گرجا جو عہد وسطیٰ میں مسجد ہوا کرتی تھی

جامعہ قرطبہ کے صحن سے عمارت کا بیرونی نظارہ

قرآنی آیات سے مزین محل کی ایک بالکنی

جامعہ قرطبہ کے مینار پر بعد کے زمانے کا نصب بُت
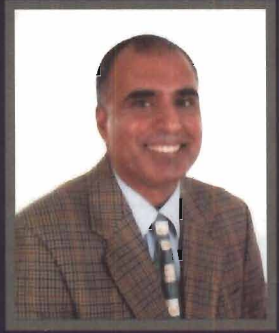
سفر کو وسیلۂ ظفر بھی قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ سیاحت انسان کے مزاج اور دلچسپی کا حصہ نہ ہوتی تو ملک، شہر اور بستیاں کیسے وجود میں آتیں، اور اس کائنات کے تخلیقی اور جمالیاتی حسن میں جو تزئین و آرائش اور عبرت و موعظت کے پہلو ہیں، ان کے بارے میں ہمارے پاس وہ وسیع تر معلومات، کائناتی انکشافات اور ارضی مشاہدات کہاں سے فراہم ہوتے جو آج دنیا کی مختلف زبانوں کے ہزاروں سفرناموں کے ذریعے ہمارے علمی ذخائر کا معتبر حصہ ہیں۔

ایک اچھا سفرنامہ تحریر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سیاح کی قوت مشاہدہ تیز ہو، وہ تلاش و جستجو میں مستعد ہو، جس مقام، ملک اور شہر کا وہ سفر کر رہا ہو وہاں کی عمارات، اداروں، شخصیات اور صنعت کے علاوہ ان کی معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیم، تہذیب، تمدن، ادب اور فنون پر بھی تجزیاتی نگاہ ڈالے۔ وہاں کے آثار قدیمہ اور عجائب و نوادر کو بالخصوص بیان کرے۔ اس علاقے کی اقدار و روایات اور وہاں کے تاریخی سرمائے پر توجہ کرے۔ پھر ان ساری معلومات کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے کے ساتھ بڑی صاف گوئی اور صداقت شعاری کے ساتھ پیش کرے۔ اسلوب تحریر ایسا اختیار کرے کہ تمام مناظر اور کیفیات کے جزئیات تک کو سمیٹ لے اور موزوں، دلچسپ، سلیس اور شگفتہ انداز سے قاری کو اپنے سفر میں شریک کرے۔

ہماری ملی تاریخ میں داستان اندلس حیرت و حزن کا عجیب سنگ میل ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن نے داستان اندلس میں جہاں مسلمانوں کی گمشدہ عظمت کو بیان کیا ہے وہاں موجودہ پسماندگی اور ذلت سے نکلنے کا نسخہ بھی تجویز کیا ہے۔ مصنف نے اپنے مشاہدات کو جس صداقت، صاف گوئی اور بے باکی سے پیش کیا ہے، اس کے باعث یہ تحریر ایک حقیقت بن کر دل پر ثبت ہو جاتی ہے۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر

Rs.

Designed by: Naveed Ahmad 0321-8401998